اُردو نامہ

ترقئ اُردو بورڈ کا باتصویر مجلّہ

اُردو نامہ

شمارہ ۱۲ - اپریل تا جون ۱۹۶۳ء

مضامین

۱ - افتتاحیہ — ادارہ ۳
۲ - چڑھتا سورج — ابوالفضل صدیقی ۷
۳ - غزل — حیرت شملوی ۵۱
۴ - وادیٔ سندھ پر یونانی اثرات — عین الحق فرید کوٹی ۵۲
۵ - حروف کا تبادل — سہیل بخاری ۴۷
۶ - سر سید راس مسعود — جمیل نقوی ۸۷
۷ - مسعود جنگ سید راس مسعود — سعید جنگ ۱۰۱

نادرات

۸ - بیجا پور کے دو گمنام شاعر — سخاوت مرزا ۴۸

شعبۂ لغت

۹ - اشتقاقیات — ڈاکٹر شوکت سبزواری ۱۰۵
۱۰ - اردو لغت، مجمل ایڈیشن، قسط ششم — ادارہ ۹۳ تا ۱۰۸

---

۱۱ - تبصرے — س - م، ا - ح - ق ۱۰۷
۱۲ - مراسلات — عبدالماجد دریا بادی، محمد سلیم، سید قدرت نقوی، سید ذاکر علی ۱۱۲

سر ورق: سرسید راس مسعود (ملاحظہ ہوں مضامین)

سید یوسف بخاری، مینیجر "اردو نامہ" نے ترقیٔ اردو بورڈ کی جانب سے شائع کیا

ترقیٔ اردو بورڈ کا سہ ماہی مجلہ

URDU DEVELOPMENT BOARD

نگراں

جناب ممتاز حسن

ادارہ تحریر

جوش ملیح آبادی   شان الحق حقی

خواجہ حمید الدین شاہد

ترقیٔ اردو بورڈ، کراچی

ٹیلیفون نمبر ۳۲۱۶۳

چندہ سالانہ: چار روپے ★ فی پرچہ: ایک روپیہ

اردو منزل، جمشید روڈ، کراچی ۵
(مغربی پاکستان)

مطبوعہ ایسٹ پریس، کراچی

اردو میں خبر رسانی کا آغاز

پاکستان پریس ایسوسی ایشن (پی پی اے) سب سے پہلی اور واحد خبر رساں ایجنسی ہے جو اردو اخبارات کو اردو ہی میں خبریں مہیا کرتی ہے ۔ اس تصویر میں جناب ممتاز حسن، صدر ترقیٔ اردو بورڈ ، پی پی اے کی اردو سروس کا افتتاح فرما رہے ہیں ۔

نشستہ : (داھنی طرف)
مسٹر عبدالکریم سومار صدر پی پی اے ،
(بائیں طرف)
شان الحق حقی رکن و معتمد اعزازی ترقی اردو بورڈ

اسی تقریب کی ایک اور تصویر : داھنے سرے پر جناب معظم علی منیجنگ ڈائرکٹر پی پی اے نظر آتے ہیں ۔

نیا ادبی انعام

ترقیٔ اردو بورڈ، کراچی، ادارۂ مصنفین پاکستان، (پاکستان رائٹرز گلڈ) کے اشتراک اور مالی تعاون سے، بچوں کے لئے دلچسپ اور مفید کتابوں کا ایک انعامی مقابلہ منعقد کر رہا ہے۔ اس مقابلے میں حسب ذیل موضوعات پر لکھی جانے والی، بہترین کتابوں پر نقد انعامات کا اعلان کیا جاتا ہے :۔

انعامات
و عنوانات

(۱) کہانیوں کا مجموعہ (کل تقریباً ۵ ہزار الفاظ)
(۲) ڈراما (۴۵ منٹ کا کھیل)
(۳) طویل کہانی (کل تقریباً ۵ ہزار الفاظ)
(۴) سیر پاکستان (پاکستان کے دلچسپ تاریخی اور جغرافیائی مقامات کا بیان، مع تصاویر)
(۵) سائنس کے کرشمے یا دلچسپ تجربے۔

ہر عنوان پر مبلغ ۵۰۰ روپے کا ایک انعام پیش کیا جائے گا۔ کتاب صاحب کتاب کی ملکیت رہے گی۔

شرائط مقابلہ حسب ذیل ہیں :۔

(۱) مسودات غیر مطبوعہ ہوں اور مقابلے میں شریک ہونے والے مصنف کی تحریر اور ملکیت ہوں۔
(۲) مسودات مکمل اور قابل اشاعت ہوں۔
(۳) زبان سادہ اور پیرایۂ بیان دلچسپ ہو۔
(۴) انعام پانے والی کتاب مصنف کی ملکیت رہے گی لیکن اس کی پہلی اشاعت کا حق ادارے کو حاصل ہوگا۔ اگر ادارے نے اس کی اشاعت منظور کی تو اس کی مناسب شرائط مصنف کے ساتھ علیحدہ طے کی جائیں گی۔
(۵) انعامات اور ان سے متعلق جملہ امور کی بابت ترقیٔ اردو بورڈ کا فیصلہ قطعی اور آخری ہوگا۔
(۶) کلاسیکی یا دوسری کتابوں کے خلاصے قبول نہیں کئے جائیں گے۔
(۷) مسودات ۳۰۔ جون ۱۹۶۳ع تک حسب ذیل پتے پر پہنچ جانے چاہئیں۔ اس کے بعد وصول ہونے والے مسودات مقابلے میں شریک نہ ہوں گے۔

سکرٹری
ترقیٔ اردو بورڈ
۶۷۲۔ اردو منزل، جمشید روڈ، کراچی ۵

اُردُو نامہ

افلاطون کا قول ہے کہ سماج میں شاعر کے لئے کوئی جگہ نہیں ۔ اس نے شاعروں کو اپنی مثالی جمہوریت سے شہر بدر کر دینے کا مشورہ دیا ہے ۔ ان کو ہار پھول پہناؤ ، سر پر تاج رکھو اور رخصت کر دو ۔ "ہم ایسے شخص کا بڑا مان کرتے ہیں ، مگر کہ دو کہ ہماری ریاست میں اس کے لئے کوئی جگہ نہیں ۔"

یہ بڑی عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے ۔ کیا ایسے شاعر اور مفکر کی باہمی لاگ ڈانٹ کہا جائے؟ لیکن افلاطون تو خود کسی شاعر سے کم نہ تھا ۔ ناقدین کا قول ہے کہ فکر کو اتنا اچھا پیرایۂ اظہار شاذ و نادر ہی نصیب ہوا ہے، اور فکر و تخیل کا اتنا اچھا امتزاج کہیں مشکل ہی سے ملتا ہے ۔ "اس کے پاس علم بھی تھا اور فن بھی ، گویا ایک بار اور صرف ایک ہی بار، شاعر اور مفکر کو ایک ہی قالب اور ایک ہی روح مل گئی تھی ۔" (ول ڈیورنٹ) شبلی کا کہنا ہے کہ " افلاطون کے ہاں چچی تلی ، کڑی اور گہری منطق ، خدائے شعر (اپالو) کے پورے جوش و جذبے کے ساتھ بڑے اچھوتے انداز میں ملی جلی نظر آتی ہے ۔ یہ امتزاج اس کے وقفوں کے آہنگ و ترنم کی آب و تاب سے پگھل کر موسیقی کا ایک رواں دواں دھارا بن جاتا ہے جو شعور کو اپنے ساتھ بہائے لئے جاتا ہے ۔" کسی شاعر نے کسی دوسرے شاعر کو اس سے بڑھ کر اور کیا داد سخن دی ہو گی ؟

لیکن پھر بھی افلاطون شاعروں کا روادار نہ تھا ۔ دراصل یہ بھی ان بہت سے تضادات میں سے ہے جو افلاطون کی شخصیت میں پائے جاتے ہیں ۔ ول ڈیورنٹ کے بقول وہ شاعروں اور ان کے توہمات کے خلاف ہے ، لیکن خود اپنی ذات سے شاعروں میں ایک شاعر کا اور توہمات میں بہت سے توہمات کا اضافہ کر گیا ۔

شاعروں کی بابت دوسری مشہور آیات و روایات کا ہم نے ذکر نہیں کیا ، کیونکہ اس بحث کو مذہبی حدود میں لے جانا مقصود نہ تھا ۔ لیکن اتنا ظاہر ہے کہ دونوں صورتوں میں ایک مثالی معاشرے کی تشکیل مدنظر تھی اور اس میں شاعر کے وجود کو من حیث الشاعر پسند نہیں کیا گیا ۔

دراصل ہمارا مقصد ادب اور پیشہ وری کے مسئلے کی طرف توجہ دلانا ہے ۔ کیا یہ ممکن یا مستحسن ہے کہ ادیب یا شاعر معاشرے میں صرف ادیب یا شاعر بن کر رہے ؟ اقوام متحدہ کے مرتب کردہ پیشوں اور حرفوں کے جائزے میں ادیبوں کو ارباب نشاط اور دوسرے اہل فن کے ساتھ سامان تفریح مہیا کرنے والوں (Entertainers) کے زمرے میں شامل کیا گیا ہے ۔ پیشے میں کوئی عیب نہیں ، نہ اس میں چنداں مضائقہ ہے کہ شاعروں کا حشر و نشر دوسرے ارباب فن کے ساتھ ہو ، خواہ ان میں نٹ اور مداری بھی شامل سہی ۔ لیکن اس تقسیم سے شاعر یا ادیب کے منصب کی پوری تعریف و تعین نہیں ہوتی ۔ شعر و ادب ، فن تو ضرور ہیں اور ان سے انسان کو ذہنی آسودگی بھی ضرور حاصل ہوتی ہے ، لیکن یہ اسی قسم کی آسودگی ہے جو حقیقت کے

تجسس اور فطرت کے رازوں کو پانے سے حاصل ہوتی ہے۔

ادب کے موضوعات پرکوئی بندش نہیں، یہ تمام زندگی پر محیط ہیں اور بہت ادنیٰ یا عامیانہ بھی ہوسکتے ہیں، لیکن اعلیٰ ادب کی ذیل میں آئیں گے توکسی ایسے تجربے کے ضرور حامل ہوں گےجو انسانی بصیرت میں کچھ اضافہ کرسکے۔ کسی صنف کو اس کے امکانات اور اعلیٰ ترین روایات سے جانچنا چاہئیے نہ کہ ادنیٰ روایات سے۔ یہاں یہ سوال بھی پیدا نہیں ہوتا کہ ادب نے اب تک کیا حقائق روشن کئے۔ جہاں تک نتائج کا تعلق ہے فلسفہ بھی انسانی ذہن کا ایک مستقل اور مسلسل عمل ہے اور بس۔ "حقیقت" کو بعض نظریات کے ذریعے تمام وکمال منکشف کر دینا ممکن تھا، نہ ہوا۔ حقیقت کو محدود نہیں سمجھا جا سکتا، یہ غیر محدود اور ابدی ہی ہوسکتی ہے، اوراسی نسبت سے انسانی جستجو کی بھی کوئی حد آخر ممکن نہیں۔ انسان اس تجسس میں بہت سی ٹھوکریں بھی کھاتا رہا ہے اور نئے مشاہدات کی روشنی میں اپنے نظریات کو پے بہ پے بدلتا بھی رہا ہے۔ اب تک فلسفے یا علم انسانی کا خلاصہ بس اسی قدر ہے۔

فکر اور شعر کے طریق الگ ہیں لیکن رخ الگ نہیں۔ شعر میں بھی انسان کے لئے بصیرت کا سامان موجود ہوتا ہے، بلکہ شاعرانہ تصورات عجیب و غیر معقول ہونے کے باوجود، منطقی افکار کی نسبت انسان کے لئے زیادہ پُر اثر اور قابل قبول ہوتے ہیں۔ ان کی یہ تاثیر بے معنی نہیں۔ شاعر کو اپنے عجیب تصورات میں بھی حقیقت کا ایک نیا رخ نظر آتا ہے۔ کائنات میں تخلیق کو فکر پر فوقیت ہے۔ تخلیق حیات کا ایک مستقل اور بنیادی عمل ہے۔ فکر صرف اسے سمجھنے اور جانچنے کی کوشش کرتا ہے۔ منطق حقائق کو پرکھ سکتی ہے، پیدا نہیں کرسکتی۔

اس جملۂ معترضہ کے بعد پھر ادب اور پیشہ وری کے موضوع پر آئیے۔ کیا یہ ممکن یا مستحسن ہے کہ ادیب زندگی میں صرف شاعر یا ادیب ہوکر رہ جائے؟ اب سے پہلے وہ شعرا جو درباروں سے منسلک ہوتے تھے، بیشک پیشہ ور شمار کئے جاسکتے ہیں۔ لہذا ادب میں پیشہ وری کی سند و روایت نا پید نہیں۔ اس دور میں بھی ادیب کو پیشہ ور بنانے کی کافی ترغیبات مہیا ہیں۔ تعلیم کے ساتھ پڑھنے والوں کا حلقہ بڑھ رہا ہے اور اسی نسبت سے نشر و اشاعت کا کارو بار بھی۔ اس کارو بار کو ایک ایسی جماعت کی ضرورت ہے جو اس کے لئے قابل اشاعت ادب مہیا کرتی رہے۔ ادیب اب معاشرے میں ایک علیحدہ گروہ کی حیثیت سے پہلے کی نسبت زیادہ پہچانے جاتے ہیں اور کسی حد تک منظم بھی ہو رہے ہیں۔ لیکن جمعیت اگر مؤثر ہو تو کچھ نہ کچھ بندشوں کی بھی حامل ہوتی ہے اور بندشیں شاعر کی طبیعت سے مناسبت نہیں رکھتیں۔ لہذا یا تو شاعر کو اپنی آزادی کسی حد تک قربان کرنی پڑے گی یا جمعیت زیادہ مؤثر ومستحکم نہ ہوسکے گی، بلکہ جھگڑے اور فساد کی بنا بھی بن سکتی ہے۔

آزادیٔ فکر شاعر کا سب سے پہلا حق ہے۔ لہذا اس کا پیشہ ور بن جانا، اس کی آزادیٔ فکر کے حق میں مفید نہیں ہوسکتا۔ ادب کوئی آزاد پیشہ نہیں۔ ادیب اپنا مال ناشر کو مہیا کرنے پر مجبور ہے اور ناشر اسے قبول یا رد کرنے کا مجاز ہے۔ پیشہ ور ادیب صرف اشاعتی کاروبار کا ایک فنی کاریگر ہی بن کر رہ سکتا ہے اور اس حیثیت سے آزاد نہیں ہوسکتا۔ ایک صورت یہ ممکن ہے کہ ادیب نشر و اشاعت کے وسائل کو اپنا لیں، لیکن جہاں تک اصولی بحث کا تعلق ہے، کاروبار کے لئے سرمائے کی شرط ہے اور سرمایہ حاصل کرنے کے لئے سود در سود کے علاوہ کچھ اور شرائط بھی ہوسکتی ہیں جو آزادیٔ افکار کے حق میں شاید مفید نہ ہوں۔ علاوہ ازیں ادیب کا کام ادب کی تخلیق ہے نہ کہ اس کا چھاپنا اور بیچنا، جس سے اس کو طبعی مناسبت نہیں ہوتی۔

یہ اس مسئلے کے چند رخ تھے۔ لیکن چند اور اہم رخ بھی ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ ادب ایک فن ہے جو خصوصی مہارت اور اسی لحاظ سے کامل توجہ اور پورا انہماک چاہتا ہے۔ ادب ہی نہیں بلکہ ہر فن کا تقاضا ہے کہ انسان اسی کا ہو رہے اور یہ پیشہ وری کے بغیر ممکن نہیں۔ ادیبوں کو اکثر غم روزگار کا شکوہ اور یکسوئی کی تمنا رہی۔ چنانچہ اس دور میں ان کے معاشی مسائل کو حل کرنے، ان کے حقوق کا تحفظ کرنے اور ادب کو فی الجملہ ایک بافراغت پیشہ بنا دینے کی ضرورت خاص طور سے محسوس کی جاتی ہے۔ انعام واکرام سے ادیبوں کو پہلے بھی نوازا جاتا رہا اور اس زمانے میں بھی حکومتیں، اہل ثروت اور رفاہ عام کے ادارے اس معاملے میں فیاضی پر مائل ہیں۔ لیکن

مشہور محقق اور مقالہ نگار جناب نادم سیتاپوری پاکستان آئے اور ایک شام بورڈ کے مہمان ہوئے۔ بائیں طرف سے: حقی، نادم سیتاپوری، مصور صدیقی، خلیق نقوی، ڈاکٹر شوکت سبزواری اور جوش ملیح آبادی۔

سوال یہ ہے کہ کیا ادیب کا فکر معاش سے یکسو ہوکر امن کے گنبد میں بیٹھ جانا اس کی شخصیت کی تعمیر یا فن کی ترقی کے حق میں مفید ہوسکتا ہے ؟ دراصل روزی تو معاشرے میں سب ہی کو میسر ہونی چاہئیے۔ یہاں روزی کا نہیں زندگی کے تجربات کا سوال ہے۔ یعنی جب تک کہ ادیب عام انسانوں کی طرح کسب معاش اور دوسری سماجی ذمہ داریوں کا بوجھ نہ اٹھائے اور دنیا کے گرم و سرد میں مبتلا نہ ہو، اس کی شخصیت نیم پختہ اور تجربات محدود رہیں گے ہر فن کے لئے انہماک شرط ہے لیکن ادب کے لئے زندگی سے شغف و انہماک ضروری ہے ، کہ یہی اس کا اصل میدان ہے ۔

ہماری ادبی تاریخ میں شاعروں کی پیشہ وری کی روایت تو ضرور ملتی ہے ، اور اس کے معنی کبھی کبھی امرا کی حاشیہ نشینی اور وظیفہ خواری بھی ہوتے ہیں ، لیکن شاعروں نے اپنے لئے جو ضابطۂ اخلاق متعین کیا ہے وہ بھی لائق توجہ ہے۔ ہمارے شعرا کے کلام میں بہت سی ایسی مشترک اقدار ملتی ہیں جو روایات سخن میں شامل ہیں اور شاعروں کے مسلمات کا درجہ رکھتی ہیں ۔ ان میں محبت اور اس کے لوازمات کے علاوہ، خودداری ، حق گوئی و بےباکی ، سخت کوشی اور آسائش دنیوی کی طرف سے سیر چشمی کو خاص امتیاز حاصل ہے ۔ فی الجملہ شاعر کا منصب زندگی میں بہت بلند ٹھہرتا ہے جس کا نبھانا آسان نہ ہو ، لیکن ترک کرنا بھی احسن نہیں ۔ کوتاہیٔ عمل میں توسبھی انسان مبتلا ہیں ۔ انسانیت صرف چند آدرشوں ہی کے سہارے قائم ہے ۔ ہم ادیبوں کے ضابطۂ اخلاق پر آئندہ زیادہ تفصیل سے بحث کریں گے۔ ضروری نہیں کہ ادیب کوئی مصلح یا پیغمبر ہو ، لیکن ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ وہ کیا ہو اور کیا نہ ہو۔ ہم اس سے صرف حق گوئی اور خوش گوئی کی توقع رکھتے ہیں ، لیکن ادب کا ایک آسودہ پیشہ بن جانا اتنا اہم نہیں جتنا کہ ادیب کا زندگی کی آگ میں تپنا اور ایک دردمند دل پیدا کرنا۔ یہ غم دوراں کے ساتھ غم جاناں کو نبھانے کا معاملہ ہے ادیبوں کو ہمیشہ ایک جہاد جاریہ سے سابقہ رہے گا ، اور کوئی ایسی صورت جو انہیں ایک آسودہ حال پیشہ ور بنادے، اُن کی آزادی یا ان کے کردار کے حق میں مفید نہیں ہوسکتی جس پر اعلیٰ ادب کی تخلیق کا دار و مدار ہے یا اس کی امیدیں وابستہ ہیں ۔ ش ۔ ح ۔ ح

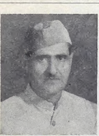

ابوالفضل صدیقی
ملاحظہ ہو افسانہ ص ۷
یہ طویل انعامی افسانہ ، لغت
کی فراوانی خصوصاً لغات الفرس کے
لحاظ سے بھی قابل توجہ ہے

چڑھتا سورج

ابوالفضل صدیقی

بچو میاں شہسوار نہ سہی تو خودرو قسم کے دھنگیتا سوار تو تھے ہی اور گھوڑا سواری کی تعلیم نہ تو بیچارے نے زینت الخیل پڑھ کر مکتب میں حاصل کی تھی اور نہ انھیں اس کے عملی سبق ان کے بڑے بھائیوں کی طرح میدان میں استاد شجاعت خاں نے دیئے تھے بلکہ کتب کے زمانہ بچپن میں قصبہ کے چماروں کسانوں نائی کمہاروں کے بچوں کے ساتھ آوارہ پھرتے مگ دھوں خچروں کو پکڑ کر کھیل میں ان پر سواریاں لیتے، کبھی دم کی جانب منہ پھیر کر اور کبھی سر کی جانب منہ کر کے بھگاتے اور ہر سواری پر پٹخیاں کھاتے۔ گھنٹہ گھنٹہ ڈوونڈ گھٹنے گھس کو دکر گرد جھاڑ کر اور ہاتھ پاؤں دھوکر چلے آتے۔ خیر مکتب کی زندگی تک کبھی کبھی یاران طریقت کے ساتھ یہ پروگرام چلتے رہے مگر اسکول میں داخل ہوتے ہی اس قسم کے کھیل میں شرم آنے لگی اور ساتھی اپنے کام کے راستوں پر پڑ گئے لیکن بچو میاں کا اندرونی اسپورٹس میں جوں کا توں رہا اور سواری کے لئے تڑپ بڑھ گئی۔ بچو میاں کے باپ چودھری کے دو بڑی گھوڑیاں تھیں اور وہ سرکاری سانڈوں کا دارندہ انچارج تھا۔ دن رات اصطبل اور مویشی خانہ گھوڑے گھوڑیوں کی ہنہناہٹوں ہی سے جھنکار تا رہتا۔ مگر بچو میاں بیچارے اتنے چھوٹے تھے کہ دونوں سواری کی گھوڑیاں ان کے لئے بہت بڑی تھیں اور وہ اپنے باپ اور بھائیوں کو گھوڑیاں کوداتے دیکھ کر من مار کر رہ جاتے ورنہ ان کی ہمت تو پڑتی کہ جھٹ کی سوار بن کر وہ بھی گھوڑیوں کے دم خم دیکھیں، مگر انھیں چڑھنے کون دیتا ورنہ ذرا سی عمر میں ہی کسی اچھے سے اچھے سوار سے کم نہ تھے۔ گر بے پیرے بے مریدے، کون مان لیتا کہ یہ بھی لگام پکڑنا جانتے ہیں۔ ایک روز اسکول سے واپس آرہے تھے اور آج جیب گرم تھی۔ ایک روپیہ تو فیس میں سے کورا بچا تھا۔ آٹھ آنے کتاب کے داموں میں سے کترے تھے اور ایک روپیہ جیب خرچ کا ملا تھا۔ راستے میں قصبے کے کانجی ہوس پر بھیڑ تھی۔ اور منشی نیلام کی بولی بول رہا تھا۔ سوا دو روپے، سوا دو روپے۔ سوا دو روپیہ، سوا دو ایک سوا دو۔ دو — نسلی کاٹھیاواڑی اصلی دیسی گھوڑی کے سوا دو روپیہ۔ سوا دو ایک سوا دو، دو — پندرہ روپے کے دھن کے سوا دو۔ اور بچو میاں بھیڑ چیر کر گھستے تو بیٹھوں کے پیچھے پندرہ روز کی بھوکی پیاسی دبلی قاق قیدی کاٹھیاواڑی کھڑی دیکھی اور اونچائی کے لحاظ سے اپنے لئے بالکل فٹ دیکھ کر ڈھائی روپیہ کہا۔ منشی نے زمین دار کے بچے کی بولی پر ڈھائی روپیہ میں تین کر دی اور وہیں سے بچو میاں اپنی خودرو ٹریننگ کے مطابق بغیر لگام کے سوار ہو کر ایال پکڑے گھر تک آئے اور مویشی خانے میں بندھوا دیا۔

اور کاٹھیاواڑی مُتقیا مویشی خانہ میں دونوں گھوڑیوں کا پس خوردہ کھاتی اصطبل سے بڑھاری ہوئی سانڈوں کی جھوٹن پر ہاتھ صاف کرتی اور بیلوں اور گایوں کے دانے چارے میں دو چار منہ حصہ بٹاتی چودھری کے چالیس پچاس مویشیوں کے بھرے مویشی خانہ میں پلنے لگی اور بچو میاں ڈھائی روپیہ کے شہسوار بن گئے۔ پچھلے سب ساتھی یہ زندہ کھلونا دیکھ کر جمع ہوئے اور اب تو لگام لگتی اور چار جامہ کسا جاتا اور باری باری سے ہم رکاب ہوتے۔ صبح شام معتد کے ساتھ سواری ہوتی اور بچو میاں کو ڈھائی روپلی کی کاٹھیاواڑی سے ایسا شوق بڑھا کہ چودھری کو اپنی پان پان سو کی پارہ ستارہ سے نہ تھا۔ گودام میں گھس جاتے۔ گھی کا لوندا اور گڑ کا ڈھیلا چراتے اور کاٹھیاواڑی کے منہ میں چپکے سے دے دیتے۔ نوکروں کے لئے بیسن کی روٹیاں پکتیں۔ باورچی خانہ میں ماما کی آنکھ بچا بچا کر دو چار روٹیاں پاجامہ کے نیفے میں، گھر میں آکر گودام میں تیل کے کپّے میں ڈبو دیتے۔ شام کو اسکول سے پلٹ کر چپکے سے کپّے میں سے نکالتے اور مویشی خانے میں لے جا کر کاٹھیاواڑی کو کھلا دیتے۔ تمام دن جھوٹن پر کاٹھیاواڑی کا منہ چلتا۔ صبح شام بچو میاں کے مال مسروقہ پر ہاتھ مارتی اور تین ہی مہینے میں دو کوڑی کی ٹٹیا رنگ پر آگئی۔ رونگٹے رونگٹے پر گھی تیل چمک اٹھا۔ مٹھی بھر اونچی سی ہو کر پھیل گئی۔

چودھری کے وسیع مویشی خانہ کی تقسیم تھی اور یہ تقسیم چودھری کو جب سے دہ (وارندہ) ہوا تھا خاص توجہ کے ساتھ کرنی پڑی تھی۔ بیچوں بیچ سرکاری سانڈوں کا اصطبل تھا جس میں تین شمال رویہ بڑے بڑے ہال تھے۔ ان میں تین سرکاری سانڈ رکھے جاتے تھے ان تینوں سانڈوں کے اصطبلوں کے سامنے وسیع صحن تھا۔ پھر تین سانڈ گدھوں کی کوٹھریاں تھیں جن میں تین سرکاری گدھے رکھے جاتے تھے اس سرکاری اصطبل کے کمپاؤنڈ سے ملحق پورب کو چودھری کے ذاتی جانوروں کا مویشی خانہ تھا اور پچھم کو نسل کشی کا احاطہ اور دونوں جانب دو دروازے تھے۔ پورب والا دروازہ مویشی خانہ میں کھلتا تھا اور پچھم والا نسل کشی کے احاطہ میں۔ مویشی خانہ میں دو بڑے اصطبل چودھری کی ذاتی گھوڑیوں کے تھے اور بقیہ چورخی سائیس چارہ کے گودام اور نوکروں کی کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں اور وسیع صحن میں جگہ جگہ تھان بنے ہوئے تھے۔

سرکاری سانڈ گورنمنٹ (ہرس بینڈری ڈیپارٹمنٹ) کی جانب سے چودھری کے سپرد ہی تھے اور عام نسل کشی کے لئے تھے ہر سانڈ کا مقررہ خرچ چودھری اپنے انتظام سے کرتا حتی کہ سانڈوں کے سائیسوں کی تنخواہ بھی اور ماہ بہ ماہ اخراجات کا بل بنا کر گورنمنٹ سے وصول کرتا رہتا۔ سائیسوں پر ایک ہیڈ البتہ براہ راست گورنمنٹ سے تنخواہ پاتا اور چودھری نے اس جگہ پر اپنے پشتینی چابک سوار استاد شہامت خاں کا نام لکھا دیا تھا۔ آٹھ روپے ماہوار فی سائیس چودھری بل میں تنخواہ دکھاتا اور استاد شہامت خاں کے بیس روپے ماہوار بھی خود رکھ لیتا۔ دو روپیہ ماہوار فی سائیس دیا کرتا اور آٹھ روپیہ ماہوار استاد کو دیتا اور سائیس اور استاد چودھری کے یہاں دونوں وقت ڈٹ کر روٹی کھاتے۔ ویسے تو ہر دارندہ کو شدید سرکاری احکام ہوتے ہیں کہ نسل کشی بالکل (فری) کی جائے۔ مگر یہ رواج بھی عام ہوتا ہے کہ ہر گھوڑی کے مالک کو جس پر بڑا سانڈ گھوڑا چھوڑا جاتا ہے دو روپیہ اور چھوٹی گھوڑی کے جس پر گدھا چھوڑا جاتا ہے آٹھ آنے دینے پڑتے ہیں اور اس طرح پانچ چھ گھوڑے گدھے سانڈوں کے سائیسوں اور ہیڈ کو معقول یومیہ یافت رہتی ہے اور چارہ دانہ راتب کا خرچ، وارندہ اپنے کھیتوں سے پورا کرتا ہے جس کے ساتھ سال بھر میں لید کی اتنی کھاد جمع رہتی ہے کہ کھیتوں کی پیداوار دوگنی تگنی ہو جاتی ہے اور ماہانہ بل کی رقم کوری وارندہ کی جیب میں چلی جاتی ہے۔ چودھری خوش حال قسم کا زمیندار تھا وہ اس سرکاری خزانے سے آئی ہوئی رقم کا بڑا حصہ حکام کی تواضع میں خرچ کرتا رہتا اور سال کے سال ایک آدھ گھوڑی خرید کر الٹ پلٹ کرتا رہتا اور نفع پاتا رہتا اور ہر طرح سے اپنی چودھراہٹ کو اس اصطبل کے ذریعہ مضبوط کرتا رہتا۔

تین سرکاری سانڈ لارڈ ڈیکسن، مرکیپل اور عرب نائٹ انصاف تھے۔ لارڈ ڈیکسن تھارو انگلش بریڈ (انگریزی نسل) تھا اور خاص انگلستان سے امپورٹ کیا گیا تھا۔ دیوار کا دیوار اونچا بڑا لمبا اور چوڑا سفید رنگ جسے سبزہ کہتے ہیں۔ بھٹا کٹی ہوئی بنڈی دم چڑھے ہوئے گول گول خوبصورت پٹھے اور جسم کے لحاظ سے ذرا متناسب ہاتھ پاؤں موزوں متکبرانہ انداز نہایت شائستہ سرکاری کاغذات میں تیس ہزار قیمت لکھی ہوئی تھی۔ مرکیپل آسٹریلین ویلر تھا اور وہیں سے امپورٹ کیا گیا تھا۔ گھوڑا کاہے کو کسی دیوزاد ملک کے گھوڑوں کا بادشاہ معلوم ہوتا تھا۔ سرنگ رنگ (زردی مائل سرخ) قدرے موٹا دونگا لمبائی چوڑائی اونچائی میں پہاڑ کا پہاڑ تگاڑا سے پٹھے اور لٹتے تن و توش پر بھی موٹے بھدے ہاتھ پاؤں تیور بھدے پریشان گوش قسم کے اور پیٹھ اتنی چوڑی کہ لمبے سے لمبے سوار کی ٹانگیں اوپر ہی پھیل کر رہ جائیں بقول شخصے چارپائی بچھالو۔ سرکاری قیمت پچیس ہزار روپے لکھی ہوئی تھی تیسرا سانڈ مشکی (سیاہ) عرب تھا، میانہ قامت چھریرا جسم، نازک نازک ہاتھ پاؤں گول گول، چکنے چکنے بھرے ہوئے سڈول پٹھے پتلی کمر لمبی متناسب گردن گھٹنوں پر کھیلتے ہوئے ایال اور زمین پر لوٹتی ہوئی دم، آنکھوں میں ہرنی کا سا بھولا پن اور سچے موتی جیسی چمک اور تیوروں میں بجلی کی سی لپک آواز میں سریلی جھنکار مزاج میں کہربا صفتی جیسے رونگٹے رونگٹے پر چنگاریاں چٹخیں، بلا کی طاقت اور غضب کی پھرتی کا مجسمہ اور اس کے ساتھ خمیر میں پرلے درجہ کی شائستگی جیتا جاگتا مجسمہ ہی محبت اطاعت ہی اطاعت، خارجی اور داخلی ہر اعتبار سے حسن ہی حسن۔ عرب نائٹ انصاف تھا۔ عربی نژاد گھوڑے کی نسل کی جڑ جس کی سرکاری قیمت بیس ہزار تھی اور عراق سے امپورٹ کیا گیا تھا اور باقی تین گدھے تھے فلسطینی مصری اور آسٹریلین جن کی مجموعی قیمت پچیس ہزار تھی اور یہ ایک لاکھ کی سرکاری امانت چودھری کی نگرانی اور پرورش میں عام نسل کشی کے لئے تھی۔ تینوں گھوڑے اپنے اپنے وسیع مربع اصطبل کے کمروں میں موٹے موٹے

بانس کے اڑگڑوں کے پیچھے کھلے رہتے اور مقررہ چارہ دانہ کھا کر لاہوری نمک کے بڑے بڑے ڈھیلوں کو چاٹتے رہتے جو اصطبل میں ٹنگے ہوئے تھے اور جب کوئی گھوڑی والا اپنی گھوڑی کا بھن کرانے لاتا تو اُستاد گھوڑی دیکھ کر سانڈ تجویز کرتے سائیس سانڈ کو بے لگام چڑھا کر نکالتا اور احاطہ میں گھوڑی پر چھوڑ دیتا اور چھوٹی گھوڑیوں اور خچریوں پر سرکاری احکامات کے مطابق گدھا چھوڑا جاتا گورنمنٹ کے سخت احکامات تھے کہ چھوٹی دیسی گھوڑیوں پر گھوڑا نہ چھوڑا جائے اور ان کے قد کے مطابق تینوں گدھوں میں سے کوئی سا چھوٹا بڑا گدھا چھوڑا جائے۔

(۲)

ساون کی ایک اندھیری رات میں سانڈوں کے اصطبل کا وہ پھاٹک جو چودھری کے مویشی خانے کی جانب تھا کھلا رہ گیا۔ اودھر بچّہ میاں کی کاٹھیاواڑی کی رسّی ٹوٹ گئی گھوڑی اگر حاملہ نہ ہو تو ہمہ وقت بہار (النگ) پر رہتی ہے اور بچہ دینے کے بعد چھٹے روز پھر النگ پر آجاتی ہے اور گابھن ہونے کے لئے تیار ہو جاتی ہے اور کاٹھیاواڑی تو مدتوں سے النگ پر تھی۔ گھوڑوں کی بُو لیتی مویشی خانہ سے سیدھی اصطبل کے کمپاؤنڈ میں پہنچ گئی پہنچتے ہی پہلا ہال لارڈ سیکس کا تھا دروازے پر پہنچتے ہی محبت بھری آوازوں کے تبادلے کے بعد لارڈ نے بڑی بے چینی کا مظاہرہ کیا اور زور سے ٹاپیں مار مار کر بار بار ہنہنا کر اڑگڑے تک لپکا باہر سے کاٹھیاواڑی نے بھی لہرالہرا کے مستانہ اداؤں کے ساتھ منہ بلایا۔ آہستہ آہستہ ٹاپیں ماریں اٹھلا اٹھلا کے سُریلی آواز نکالی۔ ہاتھ بھر کے فاصلے سے خوشبو لے لے کر لارڈ بے تاب ہو کر اندر زمین کاٹے پھینکتا تھا اور باہر کاٹھیاواڑی بل کھا کھا جاتی تھی مگر اڑگڑا بہت مضبوط تھا اور لارڈ کے باہر نکلنے کی یا کاٹھیاواڑی کی اندر پہنچنے کی کوئی شکل نہ تھی اور لارڈ تو خیر اڑگڑے کے اندر تھا مگر کاٹھیاواڑی تو آزاد تھی۔ دوسری خوشبو پر، تو برابر والے اصطبل کے دروازے پر پہنچی یہ سر کیمپبل کی آرام گاہ تھی۔ دس پندرہ من کی لاش بے چارے سر کیمپل بجز بھاری بھاری ٹاپوں کے کمزور سے زمین کوٹنے کے اور کیا کر سکتے تھے۔ اڑگڑے پر بھاری سر پٹخ پٹخ کر رہ گئے اور بھدی آوازمیں اندر سے اظہار محبت ہی کرتے رہے۔ کوئی صورت باہر نکلنے کی تو درکنار اک ذرا ہونٹ ملنے کی بھی نہ بن سکتی تھی، بس پیار بھری آوازوں میں بوسہ بہ پیام ہی ہوتا رہا اور اتنا بھی نہ ہوا کہ دو سانسیں ہی مل جاتیں۔ اتنے میں برابر سے انصاف نے سن گن پا کر اور خوبصورت کنوتیاں بدل بدل کر اپنی سریلی جھنکار میں صدائے لبیک بلند کی اور کاٹھیاواڑی، بے چند گز دھوکر اور سر کیمپل کو جوار بھاٹے میں چھوڑ کر خوش آمدید پکارتے ہوئے انصاف کے دروازے پر جوابی صدا لگائی موزوں جثہ اور کھر باصفت انصاف نے بڑی میٹھی محبت بھری ہنہناہٹ کے ساتھ پیاری کاٹھیاواڑی کا استقبال کیا اور اپنا نازک منہ بڑھا کر اڑگڑے سے باہر نکال دیا۔ مشکبو سانسیں تھرتھرا تھرتھرا کر متصادم ہو گئیں اور کاٹھیاواڑی کے نرم گرم تر نازک ہونٹوں پہ دہکتے ہوئے نم ہونٹ جھک گئے اور بیچ بیچ میں چٹاچٹ بے جا بیچ گرما گرم بوسوں کا دوطرفہ بازار گرم ہوا اور یہاں تک کہ بیقرار ہو کر اپنے ہلکے سے جسم سے انصاف نے ایک پھرکی سی لی اور پلٹ کر اندھا دھند ایک بلند جست لگائی جس میں سر دروازہ کی ڈاٹ سے ٹکرایا اور سینہ اڑگڑے کے اوپر والے بانسوں سے جا بھڑا اور پورے ایک گھوڑے کی طاقت کے ٹکراؤ کے ردعمل میں اڑگڑے کے دونوں بانس ٹوٹے اور انصاف باہر آپڑا۔ اور جب تک سوتے ہوئے سائیس اُٹھ کر پہنچیں پہنچیں عرب کاٹھیاواڑی کو اتصال مکمل ہو گیا۔ سائیسوں نے بڑی چابکدستی سے بمشکل کاٹھیاواڑی کو ہنکا کر باہر کیا اور نہایت پھرتی سے پھاٹک بند کر دیا اور بے لگام انصاف کو پچکار کر قابو پانے اور اصطبل میں بند کرنے کی کوشش کرنے لگے اور سارا احاطہ گونج اُٹھا اور اڑگڑوں کے پیچھے دونوں اصطبلوں میں قیامت برپا ہو گئی۔ ناکام لارڈ سیکس اور محروم وصل سر کیمبل اپنے اپنے تھانوں پر جوش رقابت میں بھوکے شیر کی طرح پھر پھر کر چاپڑے غصہ میں گرج گرج کر ہنہنانے لگے ٹاپوں سے اصطبل کی زمین تہ و بالا کرنے پر تل گئے۔ یہاں تک کہ اپنی اپنی کوٹھریوں میں سے گدھے تک بیتاب ہو کر ہینس پڑے مویشی خانے میں پہنچ کر کاٹھیاواڑی نے سُریلی جھنکار دار ہنہناہٹ میں پھر دعوتِ وصل دی اور اصطبل کے صحن میں تلاش میں کھر بائی پھرکیاں لیتے ہوئے مجنوں عرب کو پھر اُبال آیا۔ کاٹھیاواڑی کی رومانٹک آواز کا شیر کی گرج جیسی ہنہناہٹ میں جواب دیا۔ سائیسوں کو قابو پانا ناممکن ہو گیا اور اب کی جست میں انصاف کمپاؤنڈ کی نو دس فیٹ اونچی دیوار پھاند کر دھم سے مویشی خانے کے وسیع صحن میں جا گرا اور پھر غٹ پٹ ہو گیا۔ عرب

کاٹھیاواڑی اتصال کی ہنگامہ خیز پھر تکرار ہوئی کہ اصطبل سے جمع ہو کر سائیس دوڑے۔ مویشی خانے میں اِدھر اُدھر سے گوالے اور ہلولے بھاگ پڑے مگر انصاف تو آج کسی کو پہچان ہی نہ رہا تھا اور کلیتاً بے قید و بند تھا اور مہینہ بھر کے بچے ہوئے بے موہیرے لگام اُبلتے سانڈ کے قریب جانے کی کسی کی ہمت نہ تھی سائیسوں کی پچکاریاں بھی اس کے کان میں نہ پڑ رہی تھیں نہ وہ کسی کو پہچان رہا تھا، حد ہے کہ وہ تو آج اپنے سائیس کی آواز بھی بھول گیا تھا۔ بڑی ہوشیاری سے سب نے مل کر کاٹھیاواڑی کو آب کی مرتبہ ہنکا کر ایک کوٹھری میں بند کیا اور کاٹھیاواڑی نظروں سے اوجھل ہوئی اور ادھر انصاف کا جوش بھی کچھ ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ کوٹھری کے کواڑوں پر ٹھاپیں سر پٹخ رہا تھا کہ سائیس نے بڑی محبت سے پچکار کر گردن پر تھپکی دی اور چالاکی کے ساتھ کھٹ سے منہیرا چڑھالیا اور پھر لگام چڑھادی اور جب قابو میں کر کے دیکھا تو سب کے ہوش اُڑ گئے۔ انصاف کے دونوں نتھنوں سے خون کی دھاریں جاری تھیں۔ سر دالی چوٹ رنگ لا رہی تھی۔ دوڑ کر اُستاد شجاعت خاں کے کواٹر پر پہنچے اور اُستاد گھبرائے ہوئے آئے۔ بیس ہزار کی سرکاری امانت اور اس وقت انصاف گرم دودھ بن گیا تھا۔ خون اُبل اُبل کر تمام زمین پر بہا جا رہا تھا۔ فوراً طبی امداد کی ضرورت تھی اگر سرکاری ڈاکٹر مویشی کو رجوع کرتے ہیں تو بات حکام تک پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ یہاں سے وہاں تک جواب طلبیاں ہوتی ہیں پھر سر کی اندرونی چوٹ نہ معلوم کس کل اونٹ بیٹھے اور کیا نتیجہ ہو۔ دُور کی سوچنے والے اُستاد نے جلدی سے اپنی پُرانی عطائی بیطاری دواؤں کی خورجی منگائی اور بہت سا ٹھنڈا پانی منگایا۔ بار بار دوائیں سُنگھاتے رہے اور سر پہ پانی بہاتے رہے کہیں صبح ہوتے ہوتے خون بند ہوا۔ چودھری بالاخانے پر سو رہا تھا نیند میں یہ تو نہ سمجھ سکا کہ اصل حادثہ کیا گذرا ہے البتہ اتنا اندازہ ہو گیا تھا کہ رات بہت شور و شغب رہا ہے۔ فجر کی نماز پڑھ کر سیدھا مویشی خانہ میں آیا اُستاد نے رات کی سب روداد بیان کی اصطبل میں جا کر انصاف کا معائنہ کیا چوٹ دیکھی اور تھپکا۔ مگر اب انصاف ٹھیک تھا۔ رسمی طور پر سائیسوں کو ڈانٹا ڈپٹا اور پھر پلٹ کر مویشی خانہ میں آیا اور ذرا اشتیاق کے ساتھ کہا "ذرا چوں اور ہاں اُستاد اور وہ کہاں ہیں آپ کے بچو میاں کی کاٹھیاواڑی جن سماۃ نے یہ قیامت برپا کر دی رات میں"۔ اور ایک نوکر بند کوٹھری میں سے کاٹھیاواڑی کو لایا اور چودھری دور ہی سے دیکھ کر بول پڑا "ایں! اُستاد! ستارہ پیشانی! چہ"

اور اُستاد نے چونک کر گھوڑی کے مُنہ پر نظر ڈالی اور جب گھوڑی قریب آ کر کھڑی ہو گئی تو اُس کے چہرے پر سے انصاف کا بہہ کر آیا ہوا جما خون انگلی سے کھرچتے ہوئے بولے۔ "ہاں سرکار۔ ستارہ پیشانی بھی پیڑا پھوڑ بھی" "اور پیشانی اور ناک کا بانسا اچھی طرح کھرچ کر صاف کرتے ہوئے بولے" اور میاں مینڈھا سینگن بھی اور عقرب بھی" "اور اُستاد ابھی پیشانی کی بھونریاں دیکھ رہے تھے جب تک آنکھوں کے نیچے دو ترچھی ترچھی بھونریاں پر غور کرتے ہوئے چودھری بول پڑا اور اُستاد آنسو ڈھال بھی دھری ہوئی ہے اور اُستاد نے چونک کر غور کیا اور آہستہ سے "ہاں" کی اور پھر چودھری نے گردن کی بھونریوں پر نظر کی اور بولا "اُستاد غضب ہے غضب اور ناگ سانچن" دونوں لہرا رہے ہیں اور اب اُستاد خفیف سے ہونے لگے کیونکہ ہر گھوڑا گھوڑی ان کی نگرانی میں تھا بات ٹالنے کی غرض سے بولے اور سرکار نیز تمہ سے لگام کا سانڈ پھر تین ہفتہ کا بچا ہوا مست چھوٹی سی گھوڑی پھر یہ زبانی اور یہ دیکھے مستی میں دانتوں سے تمام سر بھنبھوڑ لیا اور یہ جو خون سر اور چہرے پر بہا ہے یہ سب انصاف ہی کا نہیں ہے اس میں اس کے سر سے بھی نکل کر مل گیا ہے بلکہ یہیں سے سرکار مل کر بہا ہوگا "مگر چودھری گہری سوچ میں تھا بولا "اور اُستاد ذرا اُس کا منہ تو کھولنا یہ سالی سیاہ تالو بھی ہوگی! اور اُستاد نے منہ کھولا اور تالو پر نظر کی اور جھکے ہی جھکے بولے جی سرکار کا خیال صحیح ہے سیاہ تالو بھی ہے کمبخت! اور پھر چودھری اوپر سے نیچے تک نظر سے پرتالا اور اندازہ کر کے کہا "اور اُستاد ناپنا تو ذرا مجھے یہ تیرہ تین معلوم ہوتی ہے"

اُستاد نے ناپ سے نے کر منہ سے (پشت کا اگلا حصہ) تک بالشتوں اور انگلیوں سے ناپ کر حساب کیا تو ناپ میں تیرہ تین ہوئی اور اپنے ہی میں چودھری نے کہا "ذرا اُستاد پیٹ دیکھنا یہ بھونری کیسی آئی ہے" "اُستاد ذرا مسکراتے ہوئے بولے ہاں سرکار میں نے بھی دیکھ لی۔ "تنگ توڑ" بھی دھری ہوئی ہے اور گندہ بغل بھی اور کھسیا کر پچھلے پاؤں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولے "اور سرکار کیا بتاؤں میں نے

کبھی ایسی دیکھی! نہیں غنی اکبر تمام خدائی کی ہوں! کھونٹا اکھاڑ بھی ہے، جب ہی تو کانجی ہوس میں آکر نیلام ہوئی، جہاں جائے گی کھونٹا توڑ بھاگے گی۔" کہنے کو تو استاد کہہ گئے مگر اور بھونریوں پر مزید بحث آجانے کے ڈر سے دل میں نادم سے ہوگئے۔ ستارہ پیشانی بلند، ٹھا سنگین، ناگ سا پھن، بھونریاں تو کھلی ہوئی خصم مار تھیں اور سیاہ تالو، آنسو ڈھال، یک یاگ ساری عمر مالک کو پریشان کرکے رُلاتی ہیں تنگ توڑ گندہ بغل مالک کو گرا کر بھاگے۔ اور یہ چودھری اور استاد دونوں ہی ایک ایک بھونری کے مجرب خواص کے محرم تھے دونوں دل ہی دل میں تجزیہ کر رہے تھے اور چودھری تلخ اور سنگلتی تیوروں سے بولا "واہ استاد واہ! بلق، پنج عیب دہوں، اور پھر مجھے تو آپ پر حیرت ہے ایسی آنکھیں موند لیں اور میں تو آپ کے اصطبل مویشی خانے میں ذرا کم آتا جاتا ہوں اور دیکھئے آج میں نے ایک نظر ڈالتے ہی بھانپ لیا۔ آپ نے میرے یہاں گھسنے کیسے دی اور پھر چھ مہینے سے میرے تھان پر باندھے پڑے ہیں جناب! اگر لڑکا لے بھی آیا تھا تو ڈھائی روپلی کی اوقات، میں تو احاطہ میں گھسنے بھی نہ دیتا سالی منحوس کو" اور پھر ذرا جواب طلب انداز میں استاد کی طرف دیکھا۔ استاد محجوب سے ہوگئے اور بولے "سرکار واقعی میری غفلت، لڑکے کا کھیل سمجھ کر میں نے نظر بھر کر دیکھا بھی نہیں اور چودھری ایسی منحوس گھوڑی کے ساتھ اپنے لڑکے کا نام سن کر دھک سے ہوگیا اور جب تک ایک مُرغ بے ہنگام سائیس بول پڑا "اور میاں یہ کیسی ہوئی کوڑھ میں کھاج، بھرا بھر ساون گھوڑی گابھن ہوئی۔ اب لوٹ ساون جائے بیائے گی اور چودھری کے سینے پر دوسرا گھونسہ پڑا جب تک ایک دوسرا بدتمیز سائیس بانگ بلند کر بیٹھا "ساون گھوڑی بھادوں گائے، ماگھ بھینس بیائے۔ آپ جائے نہیں تو مالک کو کھائے" اور اب کی مرتبہ جیسے کنپٹی کے لگے پر چودھری اُلٹ کر جا پڑا۔ اور کاٹھیاواڑی کا مالک تو اس کا پیارا بیٹا بچو میاں تھا ـــــ! ساون بیانت "گھوڑی کا مالک اور بال بھونری کی نحوستوں میں کاٹھیاواڑی کڑوا کریلا تھی تو ساون بیانت میں گابھن ہوکر نیم چڑھا ہوگئی تھی۔ چھ مہینے سے نحوست کی بوٹ بل رہی تھی اور رات تو گابھن ہوکر پاپ کی گٹھڑی سی بن گئی۔ اور پہلے تو یک دم چودھری کے دماغ میں ضرب المثل کا آخر حصہ گونجا۔ "مالک کو کھائے" اور وہ اندر ہی اندر تھرا کر رہ گیا۔ استاد بیچارے اپنی غفلت پر گناہگار سے بنے ندامت میں سر جھکائے دم بخود تھے مگر چودھری کو ضرب المثل کی شرط والے حصے میں امید کی کرن نظر آئی "آپ جائے" اگرچہ یکایک یہ بھی ان کے قابو میں نہ تھا، بچو میاں اس کا لاڈلا..... چھوٹا بیٹا کاٹھیاواڑی کو چھ مہینے سے محبوب کی طرح رکھے ہوئے تھا۔ اور وہ جانتا تھا کہ ابھی کاٹھیاواڑی کو نکالنے میں کچھ وقت لگے گا لہذا اپنا انتشار دبا کر اور ہمت کرکے نوکروں کے سامنے اپنی بات بنائی "کچھ نہیں سب فضول توہمات ہم نہیں مانتے ایک بھی۔۔ ہم تو یہ پوچھتے ہیں کہ بال بھونری کی منحوس گھوڑے گھوڑیاں کہیں گلیوں گھوروں ماری ماری پھرتی ہیں وہ تو کسی نہ کسی اصطبل یا تھان پر بندھی ہی رہتی ہیں اور ساون بیانت گھوڑی کسی کے گھر ہی میں بیاتی ہے۔ جنگل میں تو بچہ دیتی نہیں اور بھادوں بیانت گائے بھینس بھی کسی نہ کسی کھونٹے پر دوہاتی ہیں۔ کتیوں کی طرح ماری ماری تو پھرتی نہیں ہیں۔ یہ سب برہمنوں نے ٹھگی کی باتیں گڑھ لی ہیں" بات کا رُخ بدل گیا۔ ٹلا نوروں کے مطابق، ایک سائیس نے کہا "اور سرکار ہاتھ پاؤں کو کتنی اچھی ہے بیٹری! ـــــ اور اس کے منہ سے بات لے کر دوسرا بول پڑا "اور میاں ٹمی کڑوی بڑی تیکھی ایسا دوگانا کاٹتی چلتی ہے کہ لوگ تماشا دیکھتے ہیں بھرا کٹورا رکھ دو پیٹھ پہ مجال کیا جو بوند چھلک جائے" اور سب سائیس گوالے حالی موالی تعریف کرتے رہ گئے۔ مگر استاد چپ رہے وہ خوب سمجھ رہے تھے کہ چودھری لاڈلے بیٹے کی آزردگی کے سبب برائے گفتن بات ہلکی کر رہا ہے ورنہ دل کا حال وہ خوب جانتے تھے اور جانتے تھے کہ ہرگز کبھی اسے تھان پر نہ رکھے گا۔ بس چلے تو ابھی ہنکا کے باہر کردے۔

اور اب کاٹھیاواڑی پر سب کی نظریں ایسی پڑنے لگیں جیسے ناگن، چہ میگوئیاں ہونے لگیں اور یہاں تک مویشی خانے سے حویلی تک جا پہنچیں۔ چودھری کی ماں نے استفسار کیا اور چودھری تو اس خصوص میں خود ہی اپنی ماں سے رجوع کرکے مدد طلب کرنے کی سوچ رہا تھا۔ لاڈلے پوتے پر دادی نے زور ڈالا کہ کاٹھیاواڑی کو نکال دے۔ مگر بچو میاں تو مچل گئے۔ اور چودھری بیچارہ تو کیا چیز تھا اس کی ماں کے بھی قابو میں نہ آئے جن کے لاڈ کے زور پر بچو میاں کی نگاہ میں بھائیوں بہنوں ماں اور باپ تک کی کوئی حقیقت نہ تھی... اور اتفاقات کی ستم ظریفی اسکول سے

پلٹتے ہوئے بچو میاں بارش میں بھیگ گئے اور بڑا تیز بخار آیا اور ہفتے بھر بیہوش رہے اور بخار کی شدت میں ہذیانی کیفیت ہوگئی اور ہذیان میں بار بار "میری کاٹھیا واڑی" "میری کاٹھیا واڑی" بکتے رہے۔ دادی کا وسوسہ بڑھا، بچو میاں کے ہوش میں آنے سے پیشتر ہی گھبرا کر کاٹھیا واڑی قصبہ کے کٹھیا کو دان کرا دی اور سات بکرے قربان کرائے۔ ہفتہ عشرہ بعد جب بچو میاں چنگے ہو کر مویشی خانے میں پہنچے تو کاٹھیا واڑی کے نکلے جانے کا حال معلوم ہوا، دادی کے سامنے روئے پیٹے سر میں خاک ڈالی۔ حویلی کے صحن میں دھاڑیں مار مار کر لوٹیں لگائیں مگر کیا کرتے اگر کسی کے ہاتھ کاٹھیا واڑی باپ نے بیچ ڈالی ہوتی تو قیمت واپس کر کے پھیر بھی لاتے وہ تو کٹھیا کو دان کردی گئی تھی۔ باپ نے وعدہ کیا اور دادی ضامن ہوئیں کہ اب کی کتکی اشنان کے سے اس سے اچھا کاٹھیا واڑی ٹٹو خرید یں گے بیچارے صبر کر کے بیٹھ رہے اور پھر اُستاد نے سب منحوس بھونریوں پر بچو میاں کو لکچر دیا، ایک ایک کا خواص بالتفصیل سمجھایا اور اس طرح ان کے ذہن سے منحوس گھوڑی کی ملکیت اور محبت کا احساس زائل کر کے اس کی نحوست سے محفوظ کیا کتکی اشنان کے میلے سے ایسا گھوڑا خرید کرانے کا وعدہ کیا جس کے ماتھے پر تلک ہو گلے میں کنٹھ من ہو، سینہ پر دیو من ہو، جو نٹوں پر ان مہو ہو، پیٹ پر گنگا پاٹ ہو، اور پاؤں میں پدم ہو، اور پھر ان سب سعد بھونریوں کے مبارک اثرات بتلائے کہ ماتھے پر تلک ہو تو مالک ہمیشہ سربلند کنٹھ من اور دیو من ہو تو مالک اگر ہار بھی جائے تو ہار میں جیت کرلے اور پاؤں میں پدم ہو تو کبھی خود نہ ہارے وغیرہ وغیرہ اور اس طرح ایک خیالی ایسے گھوڑے کا فرضی شوق اور احساس ملکیت ان کے اندر جاگزیں کر دیا جو تمام تر سعادتوں سے مالا مال ہو، یہ گویا منحوس کاٹھیا واڑی کی نحوست سے محفوظ رہنے کی انتہائی کوشش اور حفظ ماتقدم تھا۔ مگر وعدہ بچو میاں کی فرقت کا اندمال نہ کر سکا اور وہ آرزو کرتے کہ کاش یہ سب مبارک بھونریاں ان کی کاٹھیا واڑی میں ہوتیں تو وہ کیوں گھر سے نکالی جاتی اور وہ کاٹھیا واڑی کو بھلا نہ سکے اور استاد کی بتائی ہوئی مبارک بھونریاں اپنے طفلانہ تخیل میں کاٹھیا واڑی پر چسپاں کر کر کے اپنی تمناؤں کے باطل جال بنتے رہے۔ مگر جب کبھی اُستاد کے سامنے کاٹھیا واڑی کا ذکر کرتے تو استاد استادانہ تیوروں سے گھڑکتے۔ ہوئے نفرت دلاتے، مگر بچو میاں چپ تو ہو جاتے لیکن پیاری کاٹھیا واڑی سے نفرت تو درکنار اس کی یاد ہائے! میری کاٹھیا واڑی۔ دل میں ہوک سی بن کر اُٹھا کرتی۔

اور بچو میاں تو بیماری میں اپنی تقدیر سے بچ گئے، مگر کاٹھیا واڑی کی تقدیر بگڑ گئی، کٹھیا صبح تڑکے چڑھ کر بھیک مانگنے گاؤں گاؤں نکل جاتا اور دس بارہ گاؤں نبٹا کر مٹھی مٹھی ست نجے کی پوٹیں "چٹکی پھینک" آٹے کے تھیلے اور پرشاد کے "پرو سے" دان کے چھیتڑے۔ اتارتے [۲] کی تھائی سب کچھ لادے اوپر سے خود چڑھا شام کو گھر پہنچتا اور سب مال لے کر گھر میں گھس جاتا۔ پلٹ کر کاٹھیا واڑی کو نہ دیکھتا۔ دن تمام دن کاٹھیا واڑی کٹھیا کے ساتھ ماری ماری در در پھرتی۔ بھیک کی گھگیاتی ہوئی صدا اور دینے والوں کی جھڑکیاں کان ڈالے سنتی اور کٹھیا کے تھیلیوں اور پوٹوں میں چٹکی چٹکی مٹھی مٹھی پڑتے دیکھتی اس دروازے سے اس دروازے اور اس دروازہ سے اس دروازہ گردش میں کہیں گھڑی بھر اتنا بھی موقع نہ ملتا کہ منہ دو منہ چلتے ہوئے کسی جگہ گلیارے ہری سوکھی گھاس پر مار لے پندرہ ہی دن میں سب چودھری کے یہاں کی کھائی پی نکل گئی اور مہینہ بھر میں بچو میاں کو چڑھایا رنگ روپ اُتر کر بھادوں ختم ہوتے ہوتے الگنی پر ڈالنے کو ہوگئی جیسی کانجی ہوس سے ڈھائی روپیہ میں آئی تھی۔

اور دن زیادہ گذرے فاقہ اور محنت: پیٹھ پر موٹے کٹھیا ماسن اور چٹکی پھینک کے تھیلیوں اور ست نجے کے پوٹوں کا بوجھ پیٹ [۳]

---

۲ چٹکی پھینک: یوپی میں دیہات کے اندر ہر چولھے کے قریب ایک مٹی کی ہانڈی رکھی جاتی ہے روٹی پکانے سے پیشتر ایک چٹکی اس میں ڈال کر بقیہ آٹا گوندھا جاتا ہے اور ہفتہ کے ہفتہ یہ چٹکی پھینک آٹا کٹھیا کو دان کر دیا جاتا ہے (دست نجا) چکی میں اناج ڈالنے سے پیشتر ایک کول (مٹھی بھر) خیرات کا ایک مقررہ ڈلیا یا مٹی کی چٹکی میں علٰحدہ رکھے جاتے ہیں اور چونکہ یہ مختلف النوع اناج ملے ہوئے ہوتے ہیں اسے ست نجا کہتے ہیں۔ روہیلکھنڈ میں دونوں دیہاتی اصطلاحیں خیرات کی ہیں۔ ۳ صدقہ۔

نجیب الطرفین عرب کی گراں قدر امانت کا حمل، کاٹھیاواڑی کو سر سے پاؤں تک زندگی بار ہی بار ہوکر رہ گئی۔ خیر جاٹھے تو نستم بستم گھسیٹے چیت بیساکھ میں گیہوں کی نئی پیداوار کے ساتھ کٹھیا کی توند اور کوٹھے پھیل کر بھاری پڑے فصل پر تھیلے اور پوٹیں بھی وزنی ہوئیں ادھر عرب کی امانت کا وزن یوماً فیوماً ترقی کرتا گیا اور کٹھیا کی پھیری کا حلقہ بھی دسیع ہوا تو کاٹھیاواڑی کے پاؤں من من بھر کے پھٹنے لگے اور جب تخ تخ کی زبانی جمع خرچ سے کام نہ چلتا دکھائی دیا تو کٹھیا نے دوسرا کوڑا موٹی رسی باندھ کر بٹ لیا اور جیٹھ اساڑھ بھر کاٹھیاواڑی کے گھٹنے ٹوٹتے رہے اور اساڑھ گھسیٹ کر ساون آبی لگا عرب کی امانت، پیٹ سے صبح شام میں پاؤں نکالتے ہوئے دیکھی تو کٹھیا نے دو ایک دن پیدل پھیری کی اور گھوڑی تھان پر باندھ دی اور جب ایک صبح سو کر اٹھا تو تھان پر کاٹھیاواڑی کے ساتھ عرب کی امانت اچھلتے کودتے دیکھی اور کٹھیا کے کھونٹے پر گھوڑی نے بھرا بھر ساون بیانت بچہ دیا جس کی پیدائش کی خوشی نہ مرنے کا غم، البتہ اتنا اطمینان کٹھیا کو ضرور ہو گیا کہ چلو بیٹی ہلکی ہو گئی کئی روز سے پیدل گھسٹتا تھا چٹکی بھر سونٹھ زیرہ ڈال کر دو ایک روز گڑ تیل کی گھونٹی پلائی اور ہفتہ بھر کے اندر "چھٹاؤ" کر کے کاٹھیاواڑی کٹھیا کی باربرداری کے لئے پھر تیار ہو گئی اور بدستور کام پر لگ گئی۔

اب دو سے تین ہو گئے پیچھے پیچھے بچہ آگے آگے کاٹھیاواڑی۔ اوپر کٹھیا، گانوں گانوں گھر گھر کیچڑ پانی میں لت پت، ست بجے کی پوٹیں اور چٹکی پھینک کے تھیلے بدستور کٹھیا کی تاندسی توند اور بگاڑیاتے کوٹھے جہاں کے تہاں۔ اور ستم بالائے ستم اوپر سے دباؤ اور نیچے سے کھنچاؤ ہر دروازے پر جہاں کاٹھیاواڑی ٹھہرے بچہ سوکھے تھنوں پر چسکی لگائے جس سے کٹھیا کا کوڑا اور تخ تخ ہی نجات دلائے اور اب کاٹھیاواڑی کو ناقے دو چند کھلنے لگے محنت اور رضاعت، بھوک کے حملے پسپا کرنے لگے۔ مگر کٹھیا کے کوڑے کے سہارے بڑھتی رہی، پیٹھ کا ایک ایک تھیلا اور پوٹ کٹھیا کی چربی کا ایک ایک بوٹا۔ حتیٰ کہ اناج کا ایک ایک دانہ اور آٹے کی ایک ایک چٹکی کٹھیا کا رونگٹا رونگٹا کاٹھیاواڑی پر الگ الگ بوجھ سا معلوم ہونے لگا اور ایک ایک پاؤں ایک ایک من کا ہو گیا خود اپنا وجود بار ہو گیا، سال بھر سے سر سے پاؤں تک مکھیاں اور ڈانس لیکھوں اور جوئوں کی کھینڈیں تو چوستی ہی تھیں اور عرب کی سردہری امانت باہر آ کر اور خون چوسنے لگی۔

اور کٹھیا برہمن کو تو دنیا بھر کے زیادہ سے زیادہ نقصان زیادہ سے زیادہ نفع تھے برسات کا مہینہ پنڈت جی کا سب سے بڑا روزی رساں تھا اور چیت کا طاعون ان کا سب سے بھاری سمت، سارے جہاں کی نحوستیں ان کے گھر میں برکت نازل کیا کرتی تھیں اور وہ تو نیستی ہی کے نیتوں سے ہستی قائم رکھنا اور موت کے سہارے زندہ رہنا جانتے تھے اور بھگوان کی کرپا سے ان کے پرتی جمانی کے حلقہ میں ان پیداواروں کی کمی نہ تھی ان کے حق میں موت کے لق و دق میدان اور نحوستوں کی کھیتیاں بدستور شاداب و زرخیز تھیں۔ کاٹھیاواڑی مرے یا بچہ انھیں کیا غم کہیں سے موت کا ندیں پنجہ دستگیری کرے گا اور تیرھویں میں ان کی سواری کے لئے بیلوں کی جٹ۔ اور ریلو (بیل تانگا) بھیج دے گا۔ اور نحوست سلامت رہے۔ اب کی کاٹھیاواڑی نہ سہی گڑھوائی گہیں سے نکال کر ان کے گھر چھوڑ جائے گی اور پھر پنڈت جی کاٹھیاواڑی کو لادتے بھی تھے تو ڈر کیا تھا اور تین کی جگہ تیرہ گانوں مانگتے تو کیا بات تھی، چودھری کے اوپر پڑنے والی ساری نحوستوں کے ٹھیکہ پا سے اپنے سر لیا بھی تو تھا اور اس بھاؤ چودھری کو بہت سستا چھڑایا بھی تو تھا، وہ اسے اپنے تھان پہ باندھتے تھے۔ اس کے ساتھ نہ معلوم کتنی نحوستیں بندھی تھیں۔ اور جب تک چلے چلائے جاؤ۔ دال پھلکیا کھائے جاؤ، پر عامل تھے اور جب تک کاٹھیاواڑی چل رہی تھی۔ پنڈت جی چلا رہے تھے اور ست بجے کی دال اور چٹکی پھینک کی پھلکیاں کھا رہے تھے اور گھوروں اور گلیوں میں آگے آگے کاٹھیاواڑی اور پیچھے پیچھے بچہ گھاس کوڑے سے پیٹ بھر بھر کر کام چلائے جا رہے تھے۔

(۳)

ایک روز چودھری استاد شہامت خاں اور بچو میاں شام کی چہل قدمی سے واپس آرہے تھے بستی کے قریب گھورے کے

ڈھیروں پر چرتی ہوئی ایک گھوڑی ان کے جانب مُنہ اُٹھا کر بڑے زور سے ہنہنائی اور دھگنے سے بندھے ہوئے اگلے پاؤں سے کودتی دو جست ان کی جانب بڑھی اور چودھری اور اُستاد نے تو نہ پہچانا مگر کاٹھیاواڑی تو پچھلے سال کے گھی گڑ کے ملیدے اور چکنی چپڑی روٹیاں عمر بھر نہ بھول سکتی تھی اور نہ بچو میاں ہی کا آسن اس کے دو گامے اور پو قدمے کے مزے بھولا تھا پہچان کر بے ساختہ منہ سے نکلا! اوہو میری کاٹھیاواڑی ! چہ چہ کتنی دبلی ! اباجان میری کاٹھیاواڑی ۔ اور چودھری میری کاٹھیاواڑی " سنتے ہی اُچھل پڑا اور گھوڑی کی جانب دیکھ کر موہنہ سے بے ساختہ نکلا۔ "نہیں بیٹا!! تیری نہیں کٹھیا، کی کاٹھیاواڑی ! ــــــ اور پھر کاٹھیاواڑی کو ڈری ڈری چری چری نگاہوں سے دیکھا اور میری کاٹھیاواڑی " کہنے پر چودھری کے دل میں وسوسہ گزرا اور کاٹھیاواڑی کی جانب سے نفرت کے ساتھ منہ پھیر لیا۔ اور ذرا تیز سی نگاہ سے بیٹے کی جانب دیکھا مگر بچو میاں محو تھے اور پھر بے اختیار ہو کر بول پڑے اور اباجان ۔ ابا جان ! اور میری کاٹھیاواڑی بیاگئی ؟ ــــ ہوں اس کا بچہ ! کیسا اچھا ـــــ " اور چودھری خوف و خشونت کے ملے جلے انداز میں گھر گھرا اٹھا " چپ رہو ، کٹھیا کی " اور پھر ڈری ڈری کنکھیوں سے " ساون بیانت " منحوس بچھڑے کو دیکھا جس کو گاؤں کے لوگ بول چال میں بھی بچھڑے کا درجہ نہیں دیتے اور ساری عمر بچہ ہی پکارتے کا رواج ہے اور راستہ راستہ بڑھتے کاٹھیاواڑی کے محاذ پر پہنچ گئے ۔ چودھری کے قدم سست جیسے ملک الموت سے قریب ہو رہا ہو اور بچو میاں تیز تیز لپکتے سے گویا کھوئے ہوئے کھلونے کی جانب ہاتھ بڑھا رہے ہوں : " ٹھہر لڑکے ،، ! ــــــ باپ نے مخالف آواز میں گھر کا اور بچو میاں عین کاٹھیاواڑی کے محاذ میں ٹھہر گئے اور اگلے پاؤں دھنگی ہوئی کاٹھیاواڑی نے ڈیڑھ سال پرانے عیش کی یادوں میں مری مری ہنہناہٹ کا ایک اور تحفہ پیش کیا اور ایک لنگڑی سی جست لگا کر قریب آنے کی کوشش کی اور چودھری کو ایسا معلوم ہوا کہ جیسے اس کے بیٹے پر آدم خور شیرنی جھپٹی اور باپ کی محبت اندھا دھند لپکی ، چودھری ڈھال سا بن کر درمیان میں آگیا اور بیٹے کو کھینچ کر پیچھے کر لیا ۔ ادھر بچہ اُستاد کی جانب رجوع ہوا ۔ ادھر سے بچہ بڑھا ادھر باپ کی آڑ سے بچو میاں لپکے اور استاد کے قریب پہنچ کر چکنے چکنے سفید چینی کے کھلونے کو چھوا ، اور گھبرائے ہوئے ۔ باپ نے لپک کر پھر خود سر بیٹے کو ایک جانب گھسیٹ لیا اور اتنے میں کان اُستاد ٹہنامت خاں کی بات پر لگ گئے اور آنکھیں بچہ پر اور استاد بولے ابے میاں ارے اس کی چھاتی اور گلے میں دیومن اور کنٹھ من رکھی ہوئی ہیں ساتھ ساتھ !۔ اور دیومن چھ انگل بڑھ کر میںوں سے مل گئی ہے اور پھر ہونٹوں پر ان جھو رکھی ہوئی ہے واہ واہ میاں کیا بچہ ہے اور آہاہا ! اللہ میاں نے ہاتھ سے گڑھ کر بھیجا ہے ، داہنے پاؤں میں پدم اور بائیں میں چنتامن اور واہ ! کوکھ اور ماتھے پر فصلی ، پیٹ پر گنگا پاٹ واہ کیا کہنے ! کیا کہنے بچہ ہے کہ سعادت ہی سعادت سبحان اللہ ! استاد جھوم سے گئے کیا مبارک بچہ ڈالا ہے ڈائن کاٹھیاواڑی نے کٹھیا کے کھونٹے پر جس تھان پر باندھ دو گھر بھر دے ۔ ایک مرتبہ اس کی ان مہو چو موبارہ برس عمر بڑھے اس کی فصلی جس ران اور ہاتھ تلے رہیں عمر بھر سر نہ دکھے اور اس کا یہ پدم اور چنتامن کیا کہنے نہ کبھی اسے ہارنے دیں نہ اس کے مالک کو اور اگر مالک ہارے تو ہار میں جیت کرائیں سبحان اللہ کیا مبارک کیسا شاندار بچہ ۔

اور اُستاد کے اشاروں پر دور سے ایک ایک بھونری پہچان کر چودھری کے تیوروں کی نفرت و بیگانگی ایک گونہ حیرت میں تبدیل ہو گئی اور وہ ایک دم آگے بڑھا اور بولا " اور استاد وہ تو سب ہیں اور یہ تو دیکھو ہاتھ پاؤں کا کس قدر صاف اور رنگ ڈھنگ کا کتنا بے عیب ہے اور تیور کس قدر بانکے ہیں جس وقت چھٹ کر جوانی میں بھرے گا تو تصویر بن جائے گا مگر استاد ڈھنگ تو سب انصاف کے سے لایا ہے لیکن رنگ سے یہ لارڈ ڈیکسن کا بچہ معلوم ہوتا ہے ابن استاد یہ سبزا رنگ کہاں سے لایا ۔ آپ کہتے ہیں کہ یہ عرب نائٹ کا بچہ ہے اور رنگ کہتا ہے کہ لارڈ ڈیکسن کا ، باپ مشکی ماں تیلیا اور بچہ پڑا سبزہ کیا تک ہے بھلا ہیں ؟ "

میاں انصاف کا سولہ آنے انصاف کا اور اس میں تو کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے ، عالم وجود میں آنے سے عین پیشتر باپ کا سر پھوڑا ! بھنبھوڑا ، اوہ سرکار !! اور وہ اندھیری رات کبھی نہ بھولوں گا ، تین ہفتہ کا بچا ہوا دیوانہ سانڈ

اڑ گڑا توڑ تاڑ سر چھوڑ کر باہر آپڑا۔ مشکی گھوڑا اور ساون کی اماوس کی رات! سائیس سائیس کالا سایہ سالہراتا اِدھر سے اُدھر نکل جائے۔ بے لگام موہنے سائیسوں کی ہمت نہ پڑے پاس جانے کی بھوکے شیر کی طرح بپھرا ہوا جوش میں آکر گھوڑی کا سر تک چبا گیا اور دوسری مرتبہ گھوڑی کی آواز پر لنگور کی سی جست لگا کر مویشی خانہ کے میدان میں آگرا۔ سرکار قیامت ہی برپا کر دی تھی اس بچّے کے قیام حمل کے وقت دونوں ماں باپ نے اصطبل سے مویشی خانہ تک خون کی بارش ہوئی تھی میں تو گھبرا گیا تھا کہ انصاف کا سارا خون نتھنوں سے پرنالے کی راہ بہہ جائے گا اور یہ بیس ہزار کی سرکاری امانت ہڈی بن کر اٹک جائے گی۔ مگر اللہ نے بڑا فضل کیا ایک جھٹکا کام کر گیا اور خون بند ......

اور چودھری نے بلت کاٹتے ہوئے کہا۔ وہ تو سب معلوم مگر استاد یہ سبز رنگ کہاں سے لایا، ایں؟

"کہیں سے لایا ہو مگر انصاف کا بچہ ہونے میں کلام نہیں ہو سکتا۔ تور دیکھ لیجئے ہاتھ پاؤں ٹھاٹھ سب عرب والے اور پھر سرکار آنکھوں دیکھی بات ہے کاہے کو کوئی گھوڑی آج تک اس ہنگامے کے ساتھ گابھن ہوئی ہوگی، روئے زمین پر اس کے تو انصاف کا نطفہ ہونے میں کوئی شبہ ہی نہیں ہو سکتا۔"

"ہوں، خیر شبہ تو کوئی نہیں میں نے تو رنگ کی مناسبت سے یوں ہی مذاق میں لارڈ سیکسن کا نام لے دیا تھا ورنہ کیا میں نہیں جانتا، ہاتھ پاؤں کاٹھی تور سب ڈھنگ میں انصاف کی تصویر جھلک رہی ہے اور بال بھونری میں ماں کی ضد ہے مگر یہ بگلا سا سفید رنگ کہاں سے لایا نہ معلوم..... پل گیا اور زندہ رہا تو نکلے گا بڑا بانکا جانور۔"

اور استاد نے کہا بس سرکار اسی میں بندے کو کلام ہے کہ "پل گیا اور زندہ رہا" حالت نہ دیکھ لیجئے گھوڑی کی طرف اشارہ کیا "بس یہ بھادوں کنوار ماں بچہ جی جائیں جب تک یہ جہاں تہاں گھوڑوں گیہوں مٹری گلی گھاس کا برساتی تنکا چمکتا ہے اور کاتک اگھن کی ٹھنڈ پڑتے ہی یہ مر جائے گی اور پھر یہ اپنے آپ بھوکوں مر کر رہ جائے گا۔" اور چودھری ڈر کہ ساون بیانت گھوڑی چلی جائے گی اور دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ ان کا بچو میاں اس کی نحوست سے ان کی بوڑھی ماں نے بروقت خیرے کر بال بال بچا لیا۔ اور کوئی اچھی گھڑی تھی کہ انھوں نے اسے دان کر دیا اور بچو میاں بڑی محبت سے بچھیرے کو دیکھتے ہوئے اپنے باپ کے ساتھ چلے آئے چند قدم بچھیرا بچو میاں کے پیچھے چلا اور جب یہ گلی کے موڑ کی آڑ میں آگئے تو پلٹ گیا اور بچو میاں مڑ مڑ کر دیکھتے رہے اور پھر گھر تک سوچتے آئے "کاش یہ منحوس کاٹھیاواڑی کے بھی یہ سب مبارک بھونریاں ہوتیں جن کو اس بچھیرے میں دیکھ کر اس کے باپ اور استاد جھوم جھوم گئے تو وہ کیوں بیمار پڑتے اور کاٹھیاواڑی کیوں نکالی جاتی یا پھر یہ کمبخت کاٹھیاواڑی مہینہ بھر پہلے گابھن ہو جاتی تو پھر یہ بچہ ان کا ہوتا اور پھر اس کے لئے اور بھی بڑے بڑے گھی گڑ کے لوندے چرایا کرتے ڈلیوں روٹی اور تیل کھلا کھلا کر اس کو اس دہینی کے گھوڑے کی شکل بنا دیتے جس سے ان کی منی ذہن کھیلتی ہے جو اس کے لئے وہ گنگی اشنان کے میلے سے لائے تھے اور گھی گڑ کے لوندے کیا چیز ہیں وہ تو اسے وہ سب کچھ کھلایا کرتے جو وہ خود دسترخوان پر کھایا کرتے ہیں۔ دال بھات روٹی سالن پراٹھا اور اگر وہ کھاتا تو کباب قورمہ پلاؤ تک چرا چرا کر کھلایا کرتے۔

اور کاتک کے آخر تک بچہ نے کاٹھیاواڑی کے جسم سے خون کی آخیر بوند تک چوس لی اور اگھن کی پہلی ٹھنڈی سیت چلتے ہی فاقوں کوڑوں اور چیکیوں کی ماری کاٹھیاواڑی کٹھیا کی لگام دھنگنا، باگ ڈور توڑ گئی اور عرب نائٹ کی شاندار امانت گویا قصائی کے کھونٹے پر چھوڑ گئی۔ صبح کو جب کٹھیا تھان پر آیا تو کاٹھیاواڑی مری پڑی تھی اور بچہ سوکھے مُردہ تھنوں کو لاش کے ڈھانچہ میں تھوتھنی ڈال ڈال کر ٹٹول رہا تھا، اور اسی روز شام کو کسی سائیس نے بر سبیل تذکرہ چپکے چپکے استاد کو بتایا کہ ساون بیانت کی بھینٹ ہو کاٹھیاواڑی آپ گئی..... تو (بچو میاں) مالک کے بال بال بچنے اور بڑی بی بی کی بیدار مغزی اور بروقت کاٹھیاواڑی کو نکال باہر کر دینے پر بڑی اہمیت کے ساتھ تبصرہ ہوا اور بڑے بوڑھوں کی عقل اور تدبیر اور حفظ ماتقدم کی تعریف ہوئی۔ ساتھ ہی ذکر ہوا کہ کاٹھیاواڑی کے مرنے سے پہلے کٹھیا بچھیرے سے نالاں ہو گیا تھا اور اب سوچ رہا ہے کہ اس بچے کو کیا کرے، قصائی کے بھی تو کام کا نہیں جو چھکے سے مرے ہوئے گائے کے بچھڑے بچھیا کی طرح کٹا دے جو کبھی کبھی کسی گائے کے بیانے کے چالیس دن

کے اندر مرجانے کے بعد گاؤں والے دان کر دیتے تھے اور برہمن بہت جلد خاموشی کے ساتھ کسی بکر قصاب کے ہاتھ چھریوں کے سایہ میں پرورش کرنے کے لئے فروخت کر دیتا تھا۔

صبح کو چودھری مویشی خانہ میں آیا تو استاد نے بڑے کِھلتے ہوئے انداز میں کہا لیجئے میاں مُبارک ہو آپ کا دان سُپھل ہوا گھوڑی آپ گئی۔ مالک بچا اور کنھیا سب نحوست ہضم کر گیا اور میں تو سرکار تھر تھر گیا تھا۔ اس روز صبح کے وقت آپ نے بھونریاں دیکھ کر قاعدہ میں پکڑا ہے اور آج تک نادم تھا کیا عرض کروں ساری عمر سات پُشت سے رئیسوں کا ہی کھلونا بنتے کٹی ہے غلام نے اپنے پچپن سال کی تجربہ میں ایسا غچہ نہیں کھایا۔ بچو میاں نے لاکر باندھ دی اور میں نے کوئی خیال نہ کیا۔" چودھری خوش ہوا اور کِھل کر بولا۔ "مگر استاد وہ بچہ بہت اچھا ہے۔"

کیا کہنے اب اُس کے اور پھر وہ تو ماں کی ساری نحوستوں کا زندہ جواب اور مبارک بدل ہے جس تھان پہ بندھ جائے برکت ہی برکت ہو جائے کوئی مبارک بھونری بچی ہی نہیں ہے جو نہ لایا ہو بال بال موتی پروئے سولہ سنگھار کئے آیا ہے اللہ اللہ بچہ ہے کہ سعد اکبر! اگر کہیں آپ جیسے جوہر شناس کے ہاتھ پڑ جائے تو چار دانگ عالم میں شہرہ کر دے پھر ہاتھ پاؤں رنگ ڈھنگ تیور میں کیسا یکتا!" اور چودھری نے للچا کر اشتیاق کے ساتھ کہا "پڑ کیسے جائے۔ ہمارے ہاتھ بڑی بی بی کو کون سمجھائے۔ عورتیں اتنی تو باریکیاں سمجھتی نہیں کہ اب معاملہ اس کے برعکس ہے وہ تو مرنے کی وہی ایک ٹانگ نحوست لئے جاتی ہیں۔ ورنہ ہم تو آج نیا ہی اور اللہ عزیز کر کے لے آئیں۔"

اور استاد چودھری کی مرضی پاکر خوش ہو گئے اور بولے ان سے نبٹنا میرا کام رہا میں مویشی خانہ میں کبھی اس کا تھان ہی نہیں قائم کروں گا۔ جہاں چاہے بیٹھے۔ کھائے کھیلے کودے۔ بس چلتا پھرتا رہے گا اور سرکار پُرانی فارسی ضرب المثل ہے "اسپ گشتہ بکار می آید" عمر بھر باندھ کر پالے ہیں ایک ایسا ہی سہی پھر ذرا بہاریں دیکھنا اس کے جوہر کی۔

"تو پھر لے آیئے جاکر مگر نقد قیمت دے کر "خوش خرید" چودھری نے کچھ ایسا خیال دل میں لاتے ہوئے کہا کہ قیمت دینے کے بعد ہر چیز حلال ہو جاتی ہے تو اگر ماں کے زمانے کی تھوڑی بہت نحوست لگی لگائی رہ گئی ہو تو پاک ہو جائے گی۔"

ہاں سرکار قیمت دے کر اور نہیں تو کیا۔ چلکیا سے ہم اپنا دان پھیرنے جا رہے ہیں۔

صبح سویرے سے استاد چپ چاپ اکیلے کنھیا کے گھر پہنچے۔ کنھیا بھیک کی پھیری پر جانے کی تیاری کر رہا تھا اور مٹھی بھر جو کا آٹا پانی میں گھول کر بچہ کے منہ میں تار سے انڈیل رہا تھا اور جھنجلا جھنجلا کر بچہ کی ماں سے اپنا ناجائز رشتہ قائم کرنے کی بات کر رہا تھا۔ استاد نے آواز دی اور کنھیا اُستاد کی آواز پر نکل سالے نکل سالے چلاتا بچھڑے کو نفرت کے ساتھ ہنکاتا، دھتکارتا باہر آگیا اور اُستاد نے کہا "کہو پنڈت جی اس بچہ کو پالے پڑے ہو؟"

"پالے کیا پڑے ہیں اُستاد یہ ہمارے پلے پڑ گیا ہے وہ چلی گئی اور سالی منحوس مجھ پہ جیسے پاپ مڑھ گئی" کنھیا نے گھگھیائی ہوئی آواز میں کہا۔

"تو پھر بیچ دیو نا" اُستاد نے آہستہ سے مشورہ سا دیا۔

"ارے استاد کہاں سے گاہک دوڑے گا اس کا؟" کنھیا نے کہا اور اُستاد نے اُستادانہ تیوروں کے ساتھ احسان اور دان سا کرتے ہوئے انداز میں چپکے سے دو روپے جیب سے نکال کر کنھیا کی ہتھیلی پر رکھ دیئے مگر کنھیا کی فطرت بر روئے کار آگئی اور موٹے موٹے ہونٹوں کو چاٹ کر عاجزی سے پیلے میل چڑھے دانت آگے کو نکال دیئے بھیک سی طلب کی اور استاد نے ایک اٹھنی اور ہتھیلی پہ رکھ دی اور بولے "لو بس اب تو خوش؟ پورے ڈھائی" اور بچہ ہنکا کر لے آئے۔

اور چودھری کے مویشی خانے میں دودھ دوہا جارہا تھا بچہ اپنے آپ جمنا پار وشیاما (ہانسی حصار کی ایک رنگ سیاہ گائے) کے پاس جا کھڑا ہوا اور خدا کی شان شیاما گائے نے اپنی جبلت کے خلاف چاٹ چاٹ کر عرب زادہ کا شیاواڑی بچہ کا بٹے پیار کے ساتھ استقبال کیا اُستاد کے اشارہ پر گوالے نے بھری دوھنی بچہ کے سامنے کردی اور جنم کے بھوکے اور پیدائشی فاقوں کے مارے بچہ غٹاغٹ ایک ہی سانس میں پوری بالٹی سونت گئے اور ہفتہ بھر کے اندر شیاما کے گاڑھے دودھ کی چسکیوں اور گھونٹوں میں جنمی بھوکے بچہ کی آنکھیں کھلیں تو پتہ چلا زندگی بھوک ہی بھوک نہیں اور نہ سوکھی ماں اور موٹے کنٹھیا کے کوڑوں کے پیچھے پیچھے دوڑنا ہی دوڑنا ہے، زندگی دودھ ہی دودھ ہے، اور رضاعی ماں کے پہلو میں لگے بیٹھے رہنا ہے۔ گئو ماتا کی نرم گرم پیار بھری زبان کا دستِ شفقت ہی دستِ شفقت ہے اور تھنوں سے تو شیاما ہریانہ "بجار بیل" ہی کے بچے کو پلاتی مگر چندہی روز میں اُسے عرب بچہ کے پسینے میں بھی اپنے خالص دودھ کی گندسنگھائی دینے لگی جو دودھنی میں ہو کر بچہ کے رونگٹے رونگٹے میں روغن سا بن کر چھلک پڑا تھا اور وہ جتنا اپنے بچھڑے کو پیار سے چاٹتی اتنا ہی بے ماں کے بچہ کے رونگٹے رونگٹے پر زبان پھیرتی ادھر بچو میاں کے دل کی کلی کھل گئی اور وہ بچہ کو چھوٹی بہن والے چینی کے گھوڑے کی شکل بنانے میں گھی گڑ روٹی تیل کی سب پرانی چوریاں ڈھرانے لگے اور یہ سب کچھ جیسے بچے کے پاؤں گدگدانے لگا۔ اور دیکھتے دیکھتے بچہ کے اندر بجلی کی لہروں کی طرح سنسنانے لگا، مویشی خانے میں ہرن کی طرح نظر کی کمندیں پھینکیں، چاروں طرف انواع و اقسام کی نعمتیں بکھری دیکھیں۔ رسّی باگ ڈورسے تو بے نیاز تھے طرح طرح کے چارے بکھرے پڑے تھے۔ گایوں بیلوں بھینسوں کے حصہ میں سے حِصّہ ہر تھان پر پہنچ پہنچ کر بٹانا شروع کیا اور ایک بچو میاں ہی کیا چودھری اور اُستاد سے لے کر بچہ مویشی خانہ سے باہر تک کھیل بن گیا اور بھاگن چیت لگتے لگتے صورت شکل چال ڈھال ہر اعتبار سے سچ مچ کا کھلونا بن گیا اور اب ہرے بوٹوں میں دانہ گدرایا بہار کی ہوا میں پکے اناج کی خوشبوئیں تیرنے لگیں۔ بچہ ماشاءاللہ چارہ پکڑنا تو خوب ہی سیکھ گئے تھے۔ اب مویشی خانے کا مشین سے کٹا ہوا چارہ انھیں پسند نہ آتا لہٰذا پاؤں زیادہ نکالا بیل بھینسا تو تھے نہیں ماشاءاللہ اسپ زادہ تھے اور وہ بھی "عرب بچہ" ایک زقند میں مویشی خانہ کے پھاٹک سے باہر نظر آئے اور ہرے ہرے لہلہاتے کھیتوں میں اگلے دانتوں سے کتر کتر کر میٹھے بونٹ اور دودھ دہی بھری بالیاں کترتے نظر آئے اور تیلگوں دمکتی ہوئی بہاریں فضاؤں میں کلیلیں کرتے دکھائی دینے لگے اور صبح شام اپنی جمنا پار شیاما اماں کا گاڑھے گاڑھے شیر گرم دودھ سے علیحدہ ناشتہ کرتے تمام کو دھند لکے میں بچو میاں کے گودام سے چرلیے ہوئے گھی گڑ کے لوندے کھاتے، تیل کے کپے میں ڈوبی ہوئی بیسن کی خستہ نمکین روٹیاں چباتے اور ربیع کی فصل کٹی۔ کھیت خالی ہوئے تو بچہ کھلیان پر آگئے دو منہ ایک ڈھیر پر چار منہ دوسرے ڈھیر پر تمام دن اِدھر سے اُدھر۔ اُدھر سے اِدھر کھاتے اور کھیلتے ہی دکھائی دیتے اور چودھری ہی کیا ہر کسان کے کھلیان میں بھانت بھانت کے گرم گرم تازہ تازہ غلوں پر مصروف طعام رہتے اور ہر ایک محبت کے ساتھ دیکھتا اور مبارک بھونریوں کے سبب اپنے ڈھیر پر بچہ کا منھ مارنا موجب برکت خیال کرتا، اور صبح کی دودھ بھری بھین دار بالٹی چڑھا کر گئے تمام دن کھائی کرکہیں شام کو پھر دوہائی کے وقت کا ٹھیک اندازہ کرکے مویشی خانے کو پلٹتے اور مقررہ ناشتہ کرکے اپنی جمنا پار وشیاما اماں" گائے کے کبھی دائیں پہلو سے اور کبھی بائیں پہلو میں بیٹھ جاتے اور ان کا رضائی بھائی بچھڑا تو چوری سے دودھ پی جانے کے اندیشہ میں ماں سے علیحدہ باندھ دیا جاتا مگر وہ تو دوھنی کے پینے والے تھے بے کھٹکے چھوٹے رہتے اور تمام رات شیاما پہلو سے لپٹائے بچہ پر زبان سے دستِ شفقت پھیرتی رہتی اور جب فصل کھلیان سے بھی چلی گئی اور غلہ گھروں میں پہنچ گیا تو بچہ کو پھرتے پھراتے گلیوں اور دروازوں پر کسانوں نے محبت کے ساتھ روٹی کا ٹکڑا کھلانا شروع کیا اور کہیں کہیں برکت ہونے کے خیال سے پاؤ آدھ سیر دودھ کا بھی گھونٹ پلا دیتے اور لوٹ ساون آتے آتے تو بچہ گھر گھر کے لاڈلے ہو گئے۔ اور در در پر نزول برکت کی نشانی بن گئے۔

اور دودھ کا ٹکڑا تو ماں کے پیٹ اور کنھیا کی تربیت سے لے کر تقدیر میں آئے تھے۔ اور پاؤں کی جوتی لاڈلے بچو میاں نے اتنی سر چڑھائی کہ بچہ حویلی کے اندر تک پہنچ گئے اور یہاں تک کہ دونوں وقت ہانڈیوں کی خوشبو پر لگ گئے اور دسترخوان والے دالان کے سامنے صحن میں جا کھڑے ہوتے اور کھانا کھاتے وقت بچو میاں کے پیچھے اگلی ٹاپ مار مار کے آہستہ آہستہ ہنہناتے جاتے اور شروع میں تو بچو میاں نے اور پھر سب گھر والوں نے تواضع ہی کی پھر سب راج کنوریوں اور راج کنواروں کے ہاتھ کھانے کے بعد ہی اچھی خاصی تفریح آگئی اور کبھی کبھی جب ان کے تسلے میں کوئی ایک آدھ ہڈی پھینک دیتا تو جتا یا روشیا ماں کا بیٹا ایک چھینک سی لے کر ناز کے ساتھ کان جھٹکا کہ ذرا لہراتا اور بدمزہ ہو کر گویا شکایتاً منہ پھیر لیتا اور قہقہہ پڑ جاتا کھانے کے بعد بڑی دیر تک دسترخوان کی جھوٹن سے لڑکے لڑکیاں حتیٰ کہ چھوٹی بڑی چودھرائنیں اور نوکرنیاں تک تفریح کرتیں اور جب بچہ کے مطلب کی سب جھوٹن ختم ہو جاتی اور سامنے ہڈیوں اور چھچھڑوں کی بارش ہونے لگتی تو بچہ مکدر سے ہو کر باہر چلے جاتے مگر بڑی بی بی (چودھری کی ماں) کو یہ کھیل ایک آنکھ نہ بھاتا اور وہ کبھی کبھی کھسیا کر کہہ دیتیں کہ ایک دن اس کی نحوست رنگ لائے گی۔ مشہور مانی ہوئی بات ہے کہ بڑھاپے میں مسجد کی روٹیاں مرتے دم تک تو جوانی کے سوتے ابال دیتی ہیں۔ بچپن میں دودھ کے ٹکڑے بڑی جلدی دیوانی جوانی چڑھا دیتے ہیں اور حویلی کے دسترخوان کی جھوٹن سال بھر میں بچے سے جوان بناتی ہے اور بچہ تو کسی گھر بندی نہ تھے دو ہی سال میں "بچھ" (جوان) ہو گئے پہلے تو ماں اور نانی کی عمر کی پارہ ستارہ کی خوشبو پر مویشی خانے کے اندر ہی ہنہنانے لگے مگر یہاں معاملہ ان کے باپ ماں باپ کے برعکس تھا۔ پارہ ستارہ مضبوط اڑگڑوں کے اندر تھیں اور پھر ان کے سلسلے سال کے سال سر کیمبل اور لارڈ ڈیکسن سے ملتے رہتے تھے ایسے لونڈے چھورے کی آواز پر ملتفت نہ ہوتیں اور کبھی کبھی بوڑھی پارہ تو بچہ کے اظہار عشق کے جواب میں پیار کے ساتھ بچے کی طرح پچکار دیتی اور جب یہاں پارہ اور ستارہ کو الصاف کی طرح اڑ گڑے توڑ کر باہر آنے کی ضرورت نہ پائی تو "ملک خدا تنگ نیست، پائے مرا لنگ نیست" جس طرح بچو میاں نے کمہاروں اور دھوبیوں کے خچریوں اور گدھوں پر سواریوں کی ٹریننگ خود دی تھی اسی طرح آپ بھی جا پہنچے مگر گدھیاں اور خچریاں بہت نیچی تھیں اور بچہ ماشاء اللہ دو ہی سال میں باپ سے لگ بھگ جا پہنچے تھے۔ باوجود دو تین روز دوڑ دھوپ کرنے کے کبھی فٹ نہ ہوئے اور شاید دو ایک روز سلسلہ اور چلتا تو کہیں اونچی نیچی جگہ پر کامیاب بھی ہو جاتے مگر استاد کی نظر پڑ گئی تھان پر تو قاعدہ کی رو سے باندھ سکتے ہی نہ تھے اور پھر استاد کو بچہ بچہ بنانا تھا نہ کہ انصاف یا لارڈ ڈیکسن ایک روز خورجی سے نشتر چھری نکال کر اور السی کا تیل منگا کر بچہ کو باندھ لیا اور ٹانگیوں کی مدد سے چت گرا کر پہلے نشتر سے کھال میں شگاف لگایا: پھر کوئلوں پر سے دہکتی ہوئی چھری اٹھا کر موٹی موٹی لٹکتی نسوں پر چھوا دی اور زور سے السی کا تیل حلق میں ڈال دیا اور ہمیشہ کے لئے مویشی خانہ کے اندر اور باہر بچہ کے رومان لڑانے کا سد باب کر دیا اور اپنی زبان میں بچہ کو آختہ کر دیا۔

اور آختہ ہو کر بچے کے اوپر بڑی رنگ دار جوانی چڑھنی شروع ہوئی۔ رونگٹے رونگٹے پر چمک دوڑی جیسے گھی تیل سے غوطہ مار کر نکلا چلا آرہا ہو آنکھوں کی چمک میں جیسے اپنی وادی والی دلکشی پیدا ہو گئی اور تیوروں میں ماں والی رعنائیاں کھیلنے لگیں گردن پتلی ہو کر مور کی طرح تن گئی پٹھے اٹھے تنگاڑے کی طرح گول گول اُلٹ کر اوپر جا پڑے اور بچہ سنگ مرمر کا تراشا ہوا مجسمہ بن گیا جیسے واہٹ ہارس وسکی کا اشتہار ہوتا ہے اور چودھری کو اس کی پیڈگری معلوم کرنے کا شوق پیدا ہوا ماں کی جانب سے تو قصبہ کے کانجی ہاؤس سے آگے سراغ نہ چلتا تھا۔ بس بینڈری ڈپارٹمنٹ کے کئی ایک بڑے انگریزوں نے اصطبل کے معائنہ کے لئے کیمپ کیا اور معائنہ کے بعد چودھری نے بچہ کو پیش کیا اور مشکی عرب سانڈ اور تیلیا کمیت کا ٹھیا واڑی کے کراس میں سبزا (سفید) بچہ کیسے پڑا؟ کا اہم سوال پیش کیا انگریز تحقیق کا بڑا شائق ہوتا ہے اور صاحب موصوف تعجب نائٹ انصاف کی پیڈگری کے ساتوں سرٹیفکٹوں کی تفصیل دیکھی مگر سات پشت تک ماں باپ میں کہیں سفید رنگ کا روئنگٹا نہ

نکلا تو گومگو میں پڑ کر عراق کے ہس بینڈری ڈپارٹمنٹ کو کیس ریفر کیا تو وہاں سے کئی ماہ بعد مزید تحقیقات ہو کر اور کاغذات دیکھ کر یہ پتہ چلا کہ عرب نانٹ کا چودھواں دادا سبز اتھا اور چودھویں دادا کی صورت شکل اور بال بھونری، خصلت جبلت کی جو تفاصیل لکھیں من وعن بچہ میں وہ تمام موجود تھیں۔

اور اب تو چودھری کی نگاہیں بچہ پر بہت گہری ہو گئیں۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بات تمام علاقہ میں بھی مشہور ہو گئی۔ سارا گاؤں جیسے بچّے کے وجود پر محبت کے ساتھ فخر کرنے لگا ادھر آختہ ہو کر بچہ کو بالکل ہی لوٹ معاف ہو گئی۔ بے روک ٹوک کے کمپاؤنڈ سرکاری اصطبل میں پہنچنے لگے۔ گھروں گھروں عورتوں تک میں مانوس ہو گئے اور اپنی جمنا پار وشیا ماماں سے تو اتنی محبت بڑھ گئی کہ بیان سے باہر اور بچو میاں سے تو عشق ہو گیا متناسب جسم کے ساتھ قد بھی بڑھا اور تین ہی سال کے اندر ہی اندر تینوں سواریاں لے کر اُستاد نے ٹریننگ مکمل کر دی اور بچہ میں اَلھڑپن اور طراری شوخی کی جگہ شائستہ تیزی نے لے لی اور مزاج رنگ ڈھنگ میں جیسے بالکل اپنے چودھویں دادا کو پلٹ پڑا جس کی تفاصیل عراق ہس بینڈری ڈیپارٹمنٹ سے آئی تھیں۔

روہیلکھنڈ کا مشہور دیہاتی میلہ جو گنگا کنارے رحمت خانی روہیلہ دور کی یادگار تھا آج تک اسی آن بان سے لگتا تھا اور اب تک تو قدیم رواج کے مطابق اس میں خاص روہیلہ دور کی گھوڑ دوڑ بھی ہوتی چلی آ رہی تھی۔ روہیلکھنڈ اور ہم سوانہ اضلاع کے بہترین گھوڑے گھوڑیاں خرید فروخت اور دوڑ کے لئے آتے تھے۔ ویسے تو ہر قسم کی مویشی کی خرید و فروخت، اور کاتکی بیساکھی کی پورن ماشیوں پر عقیدت کے ساتھ گنگا اشنان۔ اس میلے کی اہم ترین خصوصیتیں تھیں مگر کسی سے کم اہم یہ دیہاتی گھوڑ دوڑ بھی نہ تھی جس میں ایک سے ایک بڑھ کر اور چھ چھ مہینے ریاض کر کے دیہاتی زمیندار اپنے جانور تیار کر کے لاتے اور کسی بڑے زمیندار کے رکھے ہوئے کپ پر اور کسی بڑے سرکاری عہدہ دار کے سرٹیفکٹ پر دوڑ کا مقابلہ ہوتا۔ سب اضلاع کے کلکٹر اور روہیلکھنڈ ڈویژن کا کمشنر اس کے منتظم ہوتے اور آفیشل طبقہ کی خاص توجہ اس تاریخی قسم کی گھوڑ دوڑ پر بڑے شوق سے رہتی اور لطف یہ کہ اس کے قواعد اور ضوابط وہی پرانے دور کے چلے آ رہے تھے بازی نہ لگتی تھی سب سے تیز اور جیتنے والے گھوڑے کو "فرش" کا خطاب جیت کی سند اور چاندی کا کپ اور سوار کو سونے کا تمغہ دیا جاتا اور تجربہ کار شہامت خاں اُستاد نے دم خم دیکھ کر چوتھے ہی سال میں میلے کی گھوڑ دوڑ میں اُتار دیا اور سب کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں میدان بچہ کے ہاتھ رہا اور بڑے لمبے عرصے سے رہا یوں ایک چکر بڑھا صدیوں سے اتنے لمبے عرصہ سے کسی جانور کے بڑھنے کی روایت نہ تھی۔ دوڑ کے رجسٹر میں بچہ کے مالک کے نام کے خانے میں بچو میاں نے بجائے اپنے باپ کے اویس گڑھ لکھا یا اویس گڑھ اس قصبہ کا نام تھا جو ان کا آبائی وطن تھا اور اس جدت پر چودھری بہت خوش ہوا کیونکہ اویس اُس کے دادا نامدار تھے جنھوں نے اپنے نام پر قصبہ آباد کیا تھا اور میلے اور گھوڑوں کی تاریخ میں یہ پہلی مثال تھی کہ کوئی گھوڑا۔ بجائے کسی فرد کے کسی مقام کے نام سے شریک مقابلہ ہوا تھا۔ اور دوسری فصل بیساکھی کے میلے میں اُستاد نے پھر بچہ کو گھوڑ دوڑ میں شریک کیا اور اب کی مرتبہ میدان اور بھی زیادہ کامیابی کے ساتھ ہاتھ رہا۔ اُستاد بچہ پر خود سوار ہو کر بھگاتے اور ونگ پوائنٹ پر پہنچتے پہنچتے تو بچہ غضب ہی کر دیتا دس پانچ گز تیس پورا ایک اور کبھی پون راؤنڈ آگے ہوتا لوگ انگشت بدنداں رہ جاتے، گھوڑا ہے یا آسیب اِنچ دو اِنچ نہیں، گز دو گز نہیں فرلانگوں مارتا ہے اور کبھی پورا پورا راؤنڈ لپیٹ لیتا ہے، اگلے سال کے دونوں میلوں کی دوڑ میں جیت کا سہرا بھی اسی شان کے ساتھ بچہ کے سر رہا۔

اور اب بچہ اویس گڑھ کے کسانوں سے بڑھ کر کچھ ضلع کے کسانوں کے دلوں میں گھر کرنے لگا اور تیسری دوڑ جیت کر تو بچہ کی محبت اور جیسے ملکیت بھی تمام روہیلکھنڈ بھر کی عام ہو گئی۔ اس کی جیت کے ساتھ ہر دل عزیزی بڑھانے والی خاص چیز اس کی پرورش کا طریقہ تھا جو چھیوں اضلاع کے کسانوں کے علم میں بالتفصیل تھا یہ کہ بچہ کسی کی تنہا ملکیت نہیں، اویس گڑھ کے اندر اس کا کوئی تھان نہیں اور

اویس گڈھ کے کسان بڑے فخر کے ساتھ بچپن سے لے کر اب تک بجّو کی سوانح حیات بیان کرتے اور وہ بڑے شوق سے سنتے اور بجّو میں دلچسپی لیتے کہ اویس گڈھ کے کسانوں نے ایک ایسا ہیرو پالا جو بڑے بڑے راجپوت اور پٹھانوں کے جانوروں سے بڑھ گیا اور جتنا رشک و حسد کا جذبہ بجّو کی جانب سے روہیلکھنڈ بھر کے دوڑ میں حصہ لینے والے اور ہر سال منھ کی کھانے والے رؤسا کے دلوں میں ترقی کرتا گیا کسانوں کے دلوں میں اس کی محبت جڑ پکڑتی گئی اور دوڑ میں تو بجّو نے پہلی ہی سال روہیلکھنڈ نرلیش کی پوزیشن لے لی تھی اور اب تو ہر کسان کے دل میں ہیرو کا مقام پیدا ہو گیا اور بجّو میاں کو شروع شروع میں تو بجّو کی مناسبت اور دلچسپی کے سبب اویس گڈھ کے کسانوں کے ساتھ ایک دلی کا احساس ہوا اور پھر یہ دلچسپی اور لگاؤ جو ایک گھوڑے کی محبت سے پیدا ہوا تھا ان کے اور کسانوں کے درمیان ایک اپنائیت و اشتراک جیسا جذبہ اور ایک قرب کا احساس بننے لگا اور بجّو یک دلی یک جہتی کا ذریعہ بن گیا اور سن شعور کو پہنچتے پہنچتے کالج کی سوسائٹی اور مخصوص قسم کے مطالعہ نے بجّو میاں کو سوچنے کے طریقے میں بھی عام کسانوں سے اتنا ہی قریب پہنچا دیا اور انٹرمیجیٹ تک تو خیر کچھ دوئی کا پردہ رہا۔ مگر بی اے میں ہی وہ بھی بجّو کی طرح کسانوں کا کچھ مال منقولہ قسم کی چیز بن گئے شروع سے ہی ان کا طرز عمل اپنا کچھ علیحدہ تھا ان کے دونوں بڑے بھائی شکار کے سیزن میں حکام ضلع اور رؤسا وغیرہ ہم چشموں کی پارٹی مدعو کرتے تھے مرغابی قاز تیتر بٹیر کے شکار کے پروگرام بنتے اور کبھی کبھی شیر کے شکار کی اسکیم بن جاتی دعوتیں اڑتیں سینکڑوں روپیہ خرچ ہوتا مگر بجّو میاں ایک اچھے شکاری اور قادر انداز نشانہ باز ہوتے ہوئے بھی ان کے ساتھ کبھی شریک نہ ہوتے وہ ہمیشہ جنگل کے شکار کے پروگرام بناتے اور سانبھر ہرن چیتل جھانک بارہ سنگھے وغیرہ قوی الجثہ چرندے بڑے شوق سے مارتے اور اس سے زیادہ شوق کے ساتھ دیہات میں گوشت تقسیم کراتے۔ پارٹی میں نوجوان منچلے کسان ہوتے اور ان کے ساتھ بجّو میاں کو اپنے دونوں بھائیوں کی نسبت زیادہ مزہ آتا اور اس طرح سینکڑوں من گوشت بانٹ کر اور گھر گھر گوشت کی ہانڈیاں گرم کرا کر اور گوشت کی بہاریں دیکھ کر انھیں اس سے کہیں زیادہ لطف آتا جتنا ان کے بھائیوں کو شکار کے کیمپ میں ڈائننگ ٹیبل پر اپنے معزز مہمانوں کے ساتھ تیتر اور چپے کے روسٹ اور قاز مرغابی کے قورمہ میں آتا تھا اور بالعموم عین اُسی وقت جس وقت اُن کی یہ ٹیبل رنگا رنگ گوشتوں اور شرابوں سے مہکتی ہوتی بجّو میاں کہیں جنگل میں کوئلوں پر ہرن چکارے پاڑھے سانبھر بارہ سنگے کے گوشت کی سیخیں بھنوا بھنوا کر مزے مزے کسانوں کے ساتھ کھاتے ہوتے اور بجّو میاں کے کیمپ میں بالعموم سو سو آدمی ہوتے جن پر تھوڑا خرچ بھی کرتے اور جنگلی زندگی کا سچا لطف لیتے۔

اور اس مرتبہ میلے سے پیشتر روہیلکھنڈ بھر میں گاؤں گاؤں بڑے زور سے افواہ اڑی کہ اس گھوڑ دوڑ میں کمشنر صاحب کی میم صاحبہ کی گھوڑی بھی دوڑے گی اس دوڑ میں یہ عجیب افواہ تھی ورنہ ہر میلے سے پیشتر ہمیشہ کسی ٹھاکر پٹھان زمیندار کی گھوڑی گھوڑے کے نام کی شہرت اڑا کرتی تھی اور جب سے بجّو نے پیہم جیتنا شروع کیا تھا یہ شہرتیں بہت زور کے ساتھ طرح طرح کی حاشیہ آرائیاں کر کے اڑائی جاتیں اور پہلے سے مرعوب کرنے کی کوشش کی جاتی جس میں بالعموم جھوٹی شیخی مد نظر رہتی مگر کمشنر صاحب کی میم صاحبہ کا نام بالکل نیا تھا اور میلے کی تاریخ میں پہلی مرتبہ کوئی سرکاری عہدہ دار شریک ہو رہا تھا اور میم صاحبہ کی دوڑنے والی گھوڑی کے متعلق طرح طرح کی مافوق الفطرت قسم کی حکایتیں اور روایتیں استاد کے کان میں پڑیں اور ہر گاؤں کی ہفتہ کی پینٹھ اور نخاسے میں سے وہ ایک نئی سنائی پڑتی رہیں استاد کو سرے سے یقین نہ تھا کہ کوئی سرکاری عہدہ دار پبلک ہارس ریس میں مقابلے کے لئے اُترے گا۔ مگر جوں جوں میلہ قریب آتا گیا گاؤں کی پینٹھوں میں افواہیں تیز ہوتی گئیں اور روہیلکھنڈ بھر کی نظریں تو اپنے بجّو پر تھیں اور ہمیشہ وہ میلوں سے پیشتر بجّو کے لئے جاسوسیاں کرتے اور دور دور کے گاؤں سے اویس گڈھ کے کسانوں میں خبریں پہنچاتے اور یہ خبریں کبھی کسی راجپوت اور کبھی پٹھان زمیندار کے بھاگ کے لئے تیار ہونے والے جانوروں کے متعلق ہوا کرتیں

کہ بس اب کی بچہ نہیں جیت سکتا فلاں ٹھاکر اپنی گھوڑی کو ایسا تیار کرکے لا رہا ہے۔ فلاں پٹھان یوں گھوڑا ٹرین کراکے لا رہا ہے مگر اب کی مرتبہ تو بجز کمشنر صاحب کے اور ولایت کے سوا بات ہی کان میں نہ آتی تھی اور جوں جوں میلہ کا وقت قریب آیا یہ خبر دیہات میں گھر گھر پھیل گئی بس اب کی مرتبہ بچے کی خیر نہیں کمشنر صاحب کی میم صاحبہ کو جو گھوڑی ایک بڑے نواب نے ان کی شادی کے تحفہ میں دی تھی وہ دوڑ رہی ہے اور لندن کی انگریزی گھوڑی سے بچہ کیا جیت پائے گا۔

اور بچو میاں نے میلے سے قبل ایک تعطیل میں گھر آکر خوشی خوشی استاد کو اس دیہاتی افواہ کی حقیقت بتائی کہ چھ ماہ قبل ہمارے کمشنر صاحب شادی کرنے ولایت تشریف لے گئے تھے اور وہاں میم صاحبہ کو ہز ہائینس نے جو ان کے ایام دوشیزگی کے دوست ہیں۔ اس شادی کے موقع پر میڈم کلوڈیا نامی گھوڑی بطور تحفہ پیش کی ہے یہ تحفۂ شادی اس بات کا اعتراف ہے کہ میم صاحبہ فرانس اور انگلستان بھر میں لیڈیز میں بہترین گھوڑا سوار ہیں۔ جو تجربہ کار مبصر دوست نے مشہور گھوڑی تحفہ میں پیش کرکے کیا ہے اور یہاں تک کہ انگلستان سے رخصت ہوتے وقت اس کے ساتھ میڈیم کلوڈیا کا "پیسنج" بھی خود اپنے اہتمام سے بک کرایا ہے اور بچو میاں نے بڑی خوشی سے بیان کیا کہ ان کا بچہ میڈیم کلوڈیا کے مقابلہ پر دوڑے گا اور میں یسوا جیتے گا اور انٹرنیشنل شہرت کا مالک ہوگا۔ مگر استاد کچھ سوچ میں پڑ گئے تو بچو میاں نے کہا "کیوں استاد ڈر گئے؟ اور آپ تو کہتے تھے کہ بچہ کے ماتھے پر قشقہ اور پاؤں میں "پدم" ہے اور یہ کسی سے ہار نہیں سکتا اور یہ تو ایس کا مالک اور اس کا سوار تک کبھی کسی سے نہیں ہار سکتا۔ مگر استاد نے کوئی جواب نہیں دیا اور جوں جوں میلہ قریب آتا گیا افواہ گرم ہوتی گئی اور یہ گھوڑ دوڑ ہمیشہ سے زیادہ رنگین تر ہوتی گئی اور کیوں نہ ہوتی۔ کمشنر صاحب کی "ہنی مون" کے رنگین دور سے گزرتی ہوئی دلہن کی گھوڑی اور اس پر طرہ یہ کہ گھوڑیوں بچھڑیوں کے کچھ بین الاقوامی پوزیشن کے جوہر شناس ہز ہائینس کا تحفۂ محبت چوپال چوپال الاؤ الاؤ چرچے تھے اور ہر ایک کا دل خوف و امید میں ذیمو ذبر ہو رہا تھا اور اگر بوڑھے یہ کہتے کہ کیا بات ہے۔ اگر بچہ ہار گیا تو کون سی چھوٹی ہو جائے گی۔ ہارے گا بھی تو کمشنر صاحب کی گھوڑی سے۔ تو نوجوان گھر گھرا پڑتے اور ادب کے ساتھ ایسی بات کہنے سے بوڑھوں کو روکتے اور انہیں صبر نہ آتا۔

کمشنر صاحب بہادر چھ ماہ کی رخصت کے بعد یورپ سے شادی کرکے پلٹے۔ گھوڑی کے تذکرہ میں کمشنر صاحب نے وہیں میم صاحب سے اپنی کمشنری کی اس تاریخی گھوڑ دوڑ کا تذکرہ کیا تھا جس کی تفاصیل سن کر میم صاحب کو یہ گھوڑ دوڑ بڑی دلچسپ اور اسپورٹنگ معلوم ہوئی تھی۔ کہ آج کی دنیا میں کوئی ریس ایسی بھی ہے جس میں بازی کے جذبہ کے بجائے خالص اسپورٹنگ اسپرٹ کار فرما رہتی ہو۔ اور انھوں نے وہیں اس دوڑ میں اپنی محبوب گھوڑی کو شریک کرنے کا اشتیاق ظاہر کیا تھا جس پر صاحب پہلے کچھ ہچکچائے اور کہا کہ یہ دوڑ ہم سرکاری عہدہ دار اپنی نگرانی میں کراتے تو ضرور ہیں۔ مگر روایت چلی آتی ہے کہ اس میں اپنا جانور شریک نہیں کرتے ہیں اور صرف زمیندار لوگوں کے گھوڑے گھوڑیاں دوڑتے ہیں، شاید سرکاری عمال اس میں شرکت کرنا پرسٹیج کے خلاف سمجھتے ہیں۔ لیکن میم صاحب نے اصرار کیا تو انھوں نے کہا کہ خیر اگر میڈم کلوڈیا شریک ہوگی تو پہلے سے انتظام کرنا پڑے گا کہ یقیناً جیتے۔" اس پر میم صاحب کچھ متعجب سی ہوئیں۔ اور انھوں نے خاص طور پر جیتنے کے تیقن اور انتظام کے متعلق سوال کیا، اس کو صاحب نے مسکرا کر ٹالنا چاہا۔ مگر جب زیادہ اصرار کیا تو کہنا ہی پڑا کہ اپنے اضلاع کے کلکٹروں کو ایک اشارہ کافی ہے۔ اور وہ انتظام کرلیں گے معمولی بات ہے۔

ویسے میم صاحب کو ہز ہائینس کی پنج سالہ صحبت میں یورپ کے اندر برصغیر ہندوستان کے اونچے طبقہ کی داخلی قوت کا تو خوب ہی اندازہ تھا لیکن ابھی ہندوستان کے اندر ایک یورپین کمشنر کی طاقتوں کا اندازہ نہ تھا۔ لہٰذا انھوں نے یقینی جیتنے کے انتظام کی تفصیل

دریافت کی تو صاحب بیچارے خود بھی یہ جاننے سے کچھ عاجز سے تھے کہ ان کے عالی ماتحت اپنے اپنے علاقۂ محروسہ کے اندر ایک اشارے میں گھوڑے کو گدھا، اور گدھے کو گھوڑا کیسے بنایا کرتے ہیں۔ اور ایک آن میں ڈارون کی تھیوری پر اُلٹے پاؤں چڑھا کر آدمی کو اپنے جادو کے ڈنڈے پر بندری کا ناچ کیسے نچاتے ہیں۔ البتہ مجملاً یہ سمجھا دیا کہ اس ملک کے اندر ان کے مقدر کی لغت میں "نفی" کا لفظ نہیں آیا ہے اور زندگی صرف اثبات، استحصال اور ممکنات کی ترکیب ہے۔۔۔ اور ابھی میڈم کلوڈیا نے ہندوستان کی سرزمین پر ٹاپ بھی نہ رکھی تھی کہ وننگ پوائنٹ پر پہنچ گئی۔

اور میم صاحب بیچاری تازہ ولایت ہندوستان میں نو وارد! ایک اعلیٰ عہدہ دار کی بیوی تھیں ابھی اپنے شوہر کی عالی اصطلاحات اور عہدہ دارانہ عہدہ دار ٹیکنیکل قسم کے اشاروں سے اتنی جلدی کیسے واقف ہو جاتیں۔ کمشنری بھر کے تمام اضلاع کے کلکٹر ہماری بھاری تحفے لے کر میم صاحب کے سلام و مبارک باد کو حاضر ہوئے، ہر ایک سے میڈم کلوڈیا کا تذکرہ ہوا اور میم صاحب نے گھوڑ دوڑ میں شریک کرانے کی خواہش ظاہر کی اور ساتھ ہی نہایت آزادی اور بھولے پن کے ساتھ اپنے اور کمشنر صاحب کے وعدہ کا حوالہ دیا، اور ہر ایک نے بڑی خوشی کے ساتھ یقین دلایا اور انھوں نے اس تیقن اور انتظام کی تفاصیل دریافت کیں تو بعض نے خوبصورتی کے ساتھ ٹال دیا، تو میم صاحب کا اشتیاق اور بھی بڑھ گیا اور اس کا اندازہ کر کے دو ایک گھاگھ قسم کے پرانے تحصیل دار نسل کے کلکٹروں نے جو نو وارد قسم کے یوروپین کی نفسیات کے محرم تھے میم صاحب کی اسپورٹنگ اسپرٹ کے مطابق بات کہی اور کہا کہ ہم جانتے ہیں کہ میڈم کلوڈیا کس جوہر کی گھوڑی ہے، اور ہم اپنے علاقہ بھر کے ایک ایک جانور کو پہچانتے ہیں ہماری کمشنری تو درکنار صوبہ چھوڑ ملک بھر میں کلوڈیا کے مقابلہ کا جانور نہ نکلے گا۔ تو میم صاحب نے بھی اپنے دل کو سمجھا لیا کہ کلوڈیا ضرور جیتے گی۔ اور اپنے قدم دوڑ کر نہ سہی کمشنر صاحب کے پاؤں دوڑ کر وننگ پوائنٹ پر پہنچ گی۔ اُدھر سنگ آمد و سخت آمد! اُستاد کا تو سنتے ہی ماتھا ٹھنکا تھا کہ اب کی مرتبہ ان کے بچہ کی خیر نہیں۔

میلہ کے انتظام کے ساتھ ساتھ چھیوں اضلاع کے اندر اس مرتبہ اس جدید انتظام کے بھی احکامات چھوٹے بڑے امور عامہ کے عہدہ داروں کے درمیان آنکھوں ہی آنکھوں میں پھیل گئے اور جیسے ایک ہی اشارہ میں مکمل ہو گئے اور انھیں کی تعمیل کے سلسلہ میں کوتوال صاحب بیچارے چودھری کے یہاں بھی آئے، اور آنے کا سبب بچہ کی جانب سے سخت اندیشہ تھا اور کوتوال صاحب نے چودھری کو دوستانہ اور بچو میاں کو بزرگانہ رائے یہ دی کہ اس دوڑ میں بچہ کو میدان میں نہ اتاریں۔ اور چودھری تو پرانی چال کا زمیندار تھا صلح کن طبیعت والا، مرنج و مرنجان قسم کا آدمی کو توال صاحب کی نیتی رائے پر کچھ دھرا سا کر لیا۔ مگر بچو میاں نے جیسے پھر بچہ ہی کے دم خم کے ساتھ ان سے بات کی اور نوجوان بچو میاں کے تیور پرکھ کر اور ڈرا تھا، لے کر تجربہ کار کوتوال نے اک پینترا بدلا اور کہا "میاں صاحب زادہ میں تو تمہاری بھلائی کے لئے کہتا ہوں، تمہارا گھوڑا آٹھ مرتبہ میدان مار چکا ہے اور میڈم کلوڈیا انگریزی گھوڑی ہے، خاص ولایت کے شاہی اصطبل کی ناک ہے جس کے ماں باپ، نانا، نانی، دادا، دادی، نہ معلوم کتنی بار ڈربی ریسیں مار چکے ہیں۔ جن میں بیس بیس لاکھ کی ایک ایک بازی ہوتی ہے مفت میں کیوں کر کری کرانے کو اس کے مقابلہ پر اپنا جیتا جتایا گھوڑا ڈالو ۔۔۔ اور ذرا رکتے ہوئے زیرِ لب بڑبڑائے "اور پھر جیت بھی جاؤ بفرض محال تو اس کا نتیجہ ۔۔۔۔۔ اُوں؟

اور بچو میاں نے ایک منھ زور وکیل کے انداز میں خشک تیوروں سے سُنا، اور اس سے زیادہ ضابطہ کے ساتھ جواب دیا ۔۔۔ دیکھئے کوتوال صاحب ہار جانے والی قباحت تو آپ ہمارے سمجھنے کے لئے چھوڑئے کیونکہ اسے صرف ہمارا ہی دل محسوس کرے گا نہ کہ آپ کا، ہاں وہ، بفرض محال جیت گیا تو اس کا نتیجہ جیسا کہ ابھی آپ نے فرمایا، بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ ہم جیت گئے؟ یا آپ کا خیال ہے کہ سوا اس کے اور کچھ بھی ہو سکتا ہے یعنی کہ خدانخواستہ ہم ہار جائیں؟

اور گھاگھ کوتوال نے منطقی نوجوان کے کالج سمپوزیم والے آزاد تیور دیکھ کر مخصوص بزرگانہ انداز میں کہا، نہیں میاں تمہارا کوئی دخل نہیں، بات میرے اور میرے دوست کے درمیان ہو رہی تھی۔ چودھری صاحب سے میرے پرانے مراسم

ہیں اور میں نہیں چاہتا کہ چودھری کا گھوڑا آٹھ مرتبہ کی جیت ہار کر آئے۔ میاں صاحبزادے وہ گھوڑی بہت بگیٹ ہے۔ ہم تو تین مہینے سے کھلا پلا رہے ہیں اور ہماری ران تلے بھی عمر بھر گھوڑے گھوڑیاں ہی رہی ہیں جانور کے تیور پہچانتے ہیں مفت میں کرکری ہوگی اور گھوڑا آپ کا بیچ کھیت پٹے گا۔"

"واہ جناب واہ! یہ اچھی منطق ہے' ارے صاحب ہماری عزت ذلت کو آپ بہتر سمجھ سکتے ہیں کہ ہم خود۔؟ اور فرض کیجئے کہ ہمیں اسی میں عزت معلوم ہو کہ ہمارا گھوڑا بیچ کھیت پٹے تو پھر؟"

"اور یہی تو میں آپ کو سمجھا رہا ہوں' اور میرا کام نیک و بد دکھانا ہے۔ ہار ہارے ہے اور جیت جیتے"۔ "بڑی عنایت، شکریہ! کہ آپ ہماری جان و مال کے ساتھ ساتھ ہماری عزت کی حفاظت کا بھی راستہ بتا رہے ہیں:" اور بچو میاں کے طنزیہ تیور دیکھ کر کوتوال صاحب نے ذرا موڈ بدلا "جی ہاں میاں صاحب زادے' ابھی آپ لڑکے ہیں' آپ کو آپ کی عزت ہی کی حفاظت کا راستہ بتا رہا ہوں۔"

اور بچو میاں انتہائی ضابطہ کے انداز میں خشکی کے ساتھ بولے "لیکن جناب یہ آپ مجھ سے میاں صاحب زادے' کہہ کر کیوں خطاب کر رہے ہیں۔ ابھی جو آپ کا یہ نیا ڈی ایس پی تقرر ہو کر آیا ہے رمیش سنگھ یہ پچھلے سال میرا کلاس فیلو تھا' اور آئے تو شاید آپ حضور کہہ کر بات کرتے ہوں گے۔ اور میں لڑکا ہی ہوں ابھی؟ اور میرا نیک و بد سمجھانے کو جناب کو تکلیف کرنی پڑی ہے! ہاں تو فرمایئے اگر میں ہار جانے ہی میں اپنی عزت خیال کرتا ہوں تو مجھ کو عزت بچانے کا کون سا راستہ دکھا رہے ہیں۔" اور کوتوال صاحب جیسے کرسی پر بیٹھے ہی بیٹھے کچھ اٹینشن سے ہو گئے اور بالکل نیا انداز بنا کر مخصوص آواز میں بولے۔

"دیکھئے چودھری بچو میاں صاحب! ماشاء اللہ آپ نوجوان ہیں' عقل مند ہیں' اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں' میں جانتا ہوں' تو میرا مطلب یہ ہے کہ اگر آپ کا گھوڑا جیت گیا تو پھر یہ بات کمشنر صاحب کے لئے کتنی شاق ہوگی؟ اس پہلو پر بھی غور کیا"۔ "لیکن جیتنا تو امر محال ہے جیسا کہ ابھی آپ نے فرمایا اور ہارنا یقینی اور ایسے گھوڑے کو ہرا کر جو آٹھ مرتبہ جیت چکا ہو' کمشنر صاحب کی گھوڑی کی شہرت کتنی بڑھے گی۔ لہٰذا جناب گھوڑے کا میدان میں نہ اترنے دینا کمشنر صاحب کی شہرت کو روکنا ہے۔ اور بفرض محال ہمارے گھوڑے کی جیت اُنھیں شاق گذرے گی تو یہ تو فطری امر ہے اس میں کسی کا کیا بس' اوپن کمپٹیشن ہے۔ اور ہار جیت کی اسپرٹ ہی میدان میں لاتی ہے اور شاق گذرنے کا ہم پر کیا اثر ایں؟ کمشنر صاحب پر شاق گذرے گی۔ ہم خوش ہوں گے۔"

"پھر عرض کرتا ہوں چودھری صاحب آپ تو جوان ہیں۔ پڑھ ضرور گئے ہیں۔ یہ کالج گراؤنڈ نہیں ہے لنگوں کی ابھی سیر نہیں کی ہے ہوں تو اثر کیوں نہیں' اثر مجھ پر بھی اور آپ پر بھی۔"

"دیکھئے نا' تو آپ یوں کہیئے' وہ دوستانہ ولئے صرف ہماری ذلت والی بات نہیں تھی۔ بلکہ مطلب سعدی یوں تھا' اگر ہم کوئی کوتوال تو ہیں نہیں' جو ہم پر کمشنر صاحب کی گھوڑی کو جیت لینے کا بُرا اثر پڑے گا۔ اور نہ بچہ ہی کوتوال کا گھوڑا ہے جسے گھر بٹھا کر اور میدان مار کر کمشنر صاحب کی اعلیٰ وارفع اسپورٹس مین لائک اسپرٹ مطمئن ہو سکے۔ میڈم کلوڈیا سچ مچ روہیلکھنڈ کی ہیروئن کا درجہ اب تو بیچ کھیت بچہ کو ہرا کر ہی حاصل کر سکے گی۔ قبلہ!"

اور کوتوال نے بچو میاں کے دم خم دیکھ کر تیسرا مدھم پینترا بدلا۔ "دیکھئے صاحب جانے دیجئے اپنی بات' خیر مگر آپ میری پوزیشن پہ ہی غور کیجئے کسی کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ آج کل ہندو گردی کا زمانہ ہے اور میں آپ کے والد کا دوست ہوں۔ اگر بچہ دوڑے گا تو مجھ کو نقصان پہنچ جائے گا۔ اور پھر میں تو دوست ہوں خیر آپ ہی بتا دیجئے کہ آپ کتنے مسلمانوں کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔ آپ کی تو ذرا دیر کی واہ واہ ہو جائے گی اور مجھ پر مفت میں وہ آن ہوگی۔ اور پھر آپ یہ بھی سمجھ لیجئے کہ یہ کافر مفت میں آپ کے بھی پیچھے پڑ جائیں گے میری تو کچھ نہیں عمر بھر غیروں کے ہاتھوں نقصان پہنچے ہیں' سمجھ لوں گا ایک چرکہ اپنوں کے ہاتھوں بھی ہی بس۔"

"مدبھی سبحان اللہ" بچو میاں نے طنز یہ ہنسی ہنستے ہوئے کہا "گویا سارا اسلام آپ کے نقصان نفع میں ہے یعنی زیادہ سے زیادہ آپ کے کیریکٹر رول کی ایک بلیک انٹری بچانے کے لئے یا محض آپ کو سرخرو کرنے کے لئے میں ہزاروں لاکھوں بندگانِ خدا کو دھوکا دوں، جن کی آنکھیں اس وقت اس گھوڑدوڑ پر لگی ہوئی ہیں۔ لعنت یہ کون سا اسلام ہے کہ آپ کے کافروں کے پیچھے پڑ جانے کے ڈر سے میں لاکھوں آدمیوں سے جھوٹ بولوں۔ قبلہ آپ بھی جیت جانے کے نتائج کے لئے تیار رہئے۔ اور پھر جب میں ہی بھگتنے کو تیار ہوں تو آپ کر بھی کیا سکتے ہیں؟" اک منٹ سکوت ہو گیا۔

اور کوتوال صاحب نے بوڑھے چودھری کی جانب پر امید نگاہوں سے دیکھا اور پیشتر اس کے کہ بوڑھا باپ کچھ بول پائے، نوجوان بیٹے نے تاڑ کر کہا "کوتوال صاحب! بچہ نہ چودھری صاحب کا ہے اور نہ میرا، یہ مدھیلکھنڈ کے چار لاکھ کسانوں کا مال ہے اور ادیس گڑھ کا پورا قصبہ اس کا امانت دار ہے اور اس کے معاملہ میں کسی بھی مصلحت کے پیش نظر کوئی سمجھوتا کرنا خیانت ہے۔ اور اگر خیانت نہ کرنے کے برے نتائج مجھ کو بھگتنے پڑیں گے تو میں بخوشی انھیں بھگتنے کو تیار ہوں۔"

"اچھا اگر ہم براہ راست کاشتکاروں سے اس مسئلہ کو خوبصورتی کے ساتھ طے کرا دیں تو پھر آپ انھیں ورغلائیں گے تو نہیں۔" کوتوال صاحب نے کہا۔

"اس کے دو جواب ہیں، مدھیلکھنڈ کے تین لاکھ کسانوں کے ساتھ بچے میں ایک حصہ دار میں بھی ہوں انھیں کیا حق ہے کہ براہ راست میرے حصہ کا بھی سمجھوتہ کریں۔"

"لیکن ہر معاملہ کثرت رائے سے طے ہوتا ہے۔"

تجائیے مان لی مگر میرے پاس اگر کوئی پوچھنے آئے گا تو حق بات بتاؤں گا۔ اور سچی بات بتانا اگر ورغلانا ہے تو آپ کے نزدیک ضرور ورغلاؤں گا۔"

"ماشاءاللہ! ماشاءاللہ! کیا شوق لیڈری ہے" کوتوال صاحب نے کھسیانی بلی کی طرح کہا۔ اور برجستہ بچو میاں نے کہا "اے سبحان اللہ کیا شانِ کوتوالی ہے۔" اور دونوں کے چہرے سرخ ہو گئے۔ اور بوڑھے باپ نے خود سر بیٹے کی جانب ذرا کڑے تیوروں سے دیکھ کر قدرے تادیبی انداز میں کہا۔

"ہیں، ہیں، بچو میاں، یہ مت بھولو کہ تم اپنے گھر پر ہو اور کوتوال صاحب سے بات کر رہے ہو۔"

"جی ہاں، جی ہاں" بچو میاں نے ذرا مجوب سا انداز بنا کر کہا، "اگر کوئی دل شکنی ہوئی ہو تو مجھے افسوس ہے کہ مجبوری ہے۔ اور اگر میرے جواب کا لہجہ ناگوار ہوا ہو تو خیال فرما لیں کہ اپنے ہیڈ کانسٹیبل سے بات نہیں کر رہے تھے۔"

"اچھا آپ تشریف لے جائیے۔" عاقبت اندیش باپ نے جوان بیٹے سے کہا اور بچو میاں کو فوراً جانا پڑا۔ اور اب کمرے میں تنہا چودھری اور کوتوال صاحب دو منٹ بالکل خاموش اور ایک دوسرے کے آغاز کلام کے منتظر سے رہے اور چودھری نے کچھ الفاظ معذرت زبان پر لانا چاہے۔ تو کوتوال صاحب نے دروازہ کی جانب بہ نظر احتیاط دیکھتے ہوئے بات کاٹ دی اور بولے "چھوڑیئے چودھری صاحب، ہوں ہاں، بے کار، یہ بات اب ایسے نہیں بن سکتی۔ اور اگر آپ اب کوئی بات معاملہ کی کریں گے بھی تو اور بھی برا ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر اب آپ کا گھوڑا روکنے کی کوشش کی جائے گی تو آپ کا یہ لیڈر بیٹا معاملہ کو تمام کسانوں میں پھیلا دے گا اور حکام بالا کے کان تک یہ آواز پہنچے گی کہ گھوڑا روکا جا رہا ہے تو اگر گھوڑا لنگ بھی گیا تو بات بہت بگڑ جائے گی۔ اور رکنا نہ رکنا برابر ہوگا۔ بلکہ رکنا اور بھی برا۔"

"اچھا صاحب میں آپ سے از روئے حلف کہتا ہوں ....." چودھری نے کچھ کہنا چاہا مگر کوتوال صاحب نے بات کاٹ کر کہا "معاف کیجئے میں آپ سے حلف اٹھوانے نہیں آیا ہوں اور نتیجہ کے لئے تیار ہوں اور مجھ سے پہلے آپ بھی تیار رہئے، سمجھ لیجئے دریا میں رہ کر مگر مچھ سے بیر!"

اور یہ کہہ کر کوتوال نے پھر اس دروازہ کی جانب دیکھا جس سے بچو میاں باہر گئے تھے۔ اور پیشتر اس کے کہ چودھری کچھ کہہ پائے اُٹھ کر بغیر علیک سلیک یہ جا، وہ جا۔

کوتوال صاحب، کوتوال ہی، مگر چودھری بھی تو چودھری تھا۔ کوئی ڈھنڈ ہولا یا تو تھا نہیں ادھر کوتوال صاحب کے پاس ٹھنڈا کر کے کھانے کے لئے وقت نہ تھا۔ اور ریڈی جسٹس کا استعمال ممکن نہ تھا۔ کیونکہ معاملہ نہایت نازک تھا اور انھوں نے تو خود ہی خیال کر کے چودھری کے شایانِ شان بات کہی تھی۔ جس میں چودھری کی بھی بنی رہتی ورنہ وقت کا تقاضا تو یہ تھا کہ بچو کو مقابلہ پر لا کر گھسٹنے کی فرمائش ہوتی۔ وہ کلکٹر صاحب اور سپرنٹنڈنٹ صاحب کو اطمینان دلا چکے تھے۔ میلہ لگ چکا تھا۔ اور بس میں دو تین روز باقی تھے کوتوال صاحب کی ہر دھار کُشتی پڑ چکی تھی اور ابھی تو صرف ٹمعا کے پوائنٹ پر آ گیا تھا اور ایسے چڑ کنم قسم کے نازک مواقع پر ضلع بھر بلکہ دور دور کے تھانے دار اور حلقہ انسپکٹر اپنے اُستاد شیخ مشرف الدین ریٹائرڈ تھانے دار سے رجوع کیا کرتے تھے۔ ویسے تو شیخ جی کے پاس اب رائے ہی رائے رہ گئی تھی۔ مگر کبھی کبھی ان کی رائے تھانے داروں کی ہمت کے ساتھ شامل ہو کر ایٹمی قوت ثابت ہوتی۔ ورنہ ملمس اور پٹاس کی طرح مل کر پٹاخے کی بارود تو بن ہی جاتی یوں تو شیخ جی کا فیض عام تھا۔ لیکن خاص کر تھانے داروں اور حلقہ انسپکٹروں کے حق میں تو شیخ جی کی ذات بابرکات ریٹائر ہونے کے بعد اللہ میاں نے فرشتۂ رحمت بنا دی تھی۔ بڑے بڑے اُلجھے معاملے شیخ جی چٹکیوں میں سلجھاتے اور مکڑی کے جالے میں مکھی کی طرح پھنسے ہوئے سرکاری اہل کاروں کو اس طرح صاف نکال کرے جاتے جیسے صابن میں سے تار۔

ریٹائر ہوئے دس سال ہو چکے۔ سروس کی تیس سالہ میش بہا مدت اور پانچ سالہ توسیع کا زرّیں دور پورے پینتیس سال کانسٹبلی سے شروع کر کے تھانے داری تک گذر رہے تھے۔ اور ہر دور میں شیخ جی یو۔ پی پولس کی رائے، بیدار مغزی اور بہادری کی نمائندگی کرتے رہے تھے۔ پانچ برس کانسٹبلی۔ دس سال ہیڈ کانسٹبلی اور پورے بیس سال تھانے داری کی اور سراغ رسی کی بوالعجبیوں میں فکر رسا ہمیشہ علوم غیب تک پہنچتی رہی۔ خاص طور پر جامہ تلاشی اور خانہ تلاشی میں تو ایسا ہاتھ صاف تھا کہ بڑے بڑے پٹارے والے مداری اور بھاری جھولے والے بازی گر انگشت بدنداں تھے۔ اور آنکھوں سے سرمہ پونچھنے والے جیب کترے سر گریباں! ہمت اور بہادری یہ کہ ہیڈ کانسٹبلی کے زمانہ میں ایک اشارے میں بیر تھ کی جگمگاتی نوچندی لٹوائی۔ تھانہ داری کے دور میں کھڑے کھڑے گوترہ کا گھما گھم میلہ درہم برہم کرایا، کوتوالی کے چارج میں چٹکی بجاتے بریلی کا بھرا بازار چاٹ کے خوانچے سے کر صرافے کی تجوریوں تک نچوا لیا۔ بیدار مغزی کا یہ عالم کہ جس شہر میں تعینات ہوئے چکلے بھر کی رنڈیوں اور اڈے بھر کی خانگیوں کے ہسٹری شیٹ کھول کھول کر انھیں راہ راست پر لانے کی عملی مہم کی، جہاں ہندو مسلم فساد ہونے والا ہوا وہاں ہرگز نہ ہونے دیا۔ اور جہاں نہ ہونے والا ہوا وہاں ان کے زمانے میں ضرور ہوا۔ علاقہ بھر میں جس گاؤں میں دو چار منچلوں نے اک ذرا پولس کے خلاف سر اٹھایا۔ شیخ جی نے پورا گاؤں کا گاؤں ہی دیا سلائی دکھو، کر چھم سے پھونک پورب میں اُتار دی۔ اور اپنی تھانے کے نہیں جس ضلع میں رہے ضلع بھر کے بڑے بڑے قاتل ڈاکو آدھی رات شیخ جی کا نام لے کر کسان کی لو بکرٹے نکلا کرتے اور پچھلے پہر شیخ جی کا نام جپتے پلٹا کرتے۔ تھانگی گروہ بند بد معاش زانوئے ادب تہ کرتے، کھری دار" (قمار خانے کے نیجر) اور کوکین کے ہنڈے خفیہ فروشوں کا تو یہ حساب کتاب تھا کہ صبح ہی صبح لچھمی دیوی کی صورت بن بلائے محلے بھر کے دھندے لو رنال کا ہی کھاتہ لئے سلام کو جا حاضر ہوتے۔ نوجوان بد مظلتے اور صبح فیرے اٹھائی گیرے تربیت پاتے پاتے قینچی نقب زنی ایک ایک تاؤ میں رہزن بنتے اور نئے رہزن ایک پھونک میں ڈکیتی کی پوری سیڑھیاں چڑھ جاتے۔ سروس بھر شیخ جی کی ذات رسالۂ "ست تلنہ" کا معمہ بنی رہی اور انعام کا میزان ہمیشہ اپنی ذات کے حق میں گنتا رہا تھانہ داری کی ان بیش قیمت خداداد زرّیں صلاحیتوں پر نظر کرتے ہوئے جوہر شناس حکام بالا نے شیخ جی کی سروس کے آخر دس سال ان کی ڈیوٹی مشہور ڈاکو سلطانہ کی گرفتاری کے سلسلہ میں کار خاص پر لگائی اور بقیہ توسیع کے پانچ سال ترتیبِ مقدمہ گینگ کیس سلطانہ ڈاکو میں گذرے اور بس اسی زمانے سے شیخ جی کا دل پلٹا اور کنگ پولیس میڈل پا کر

ریٹائر ہوگئے اور بقیہ عمر یادِ الٰہی میں بسر کرنے کا تہیہ کرلیا۔ ویسے سلطانہ ڈاکو کو جہنم رسید کرا کر اور اپنی جان جوکھم میں ڈال کر مخلوق خدا کو اس موذی کے ظلم سے نجات دلانا ان کی سروس کا آخیر غازیانہ کارنامہ ہی کیا کم تھا جو اپنی جگہ پر ہر پہلو سے خیر جاری کی تعریف میں آتا تھا۔ لیکن اس کے علاوہ نہ معلوم کتنی سعادتیں ملازمت کے دور میں حاصل کر چکے تھے۔ ایک معمولی بات یہ تھی کہ نکاح بیوگان کے ہمیشہ سے بہت زیادہ قائل رہے تھے اور زمانۂ ملازمت میں حتی الوسع اس پر کئی مرتبہ عمل کیا تھا۔ ریٹائر ہونے کے عین بعد ہم خرما و ہم ثواب اس نیک کام کے ساتھ ساتھ تبلیغ اسلام کی سعادت بھی ہاتھ آئی۔ اس کی داغ بیل تو انھوں نے سروس کے آخیر سالوں میں جب سلطانہ کے مقدمے کی ترتیب دے رہے تھے ڈال دی تھی اور سلطانہ کی بیوی کو اسی زمانے میں مقدمہ کی پیروی کے ساتھ ساتھ نیک راہ پر لگانا شروع کردیا تھا۔ یہاں تک کہ اس سونے کی چڑیا پر ہاتھ دھر دیا اور اس کو مٹھی میں لے کر اس کے سازباز سے مقدمے کے ثبوت میں مدد لی اور مقدمہ کامیاب کرا کر اسے مشرف بہ اسلام کیا اور سلطانہ کی پھانسی کے بعد نکاح کرلیا۔ نکاح کرنے کے بعد اگرچہ پینتیس سال کے تھکے تھکائے تھے مگر آرام نہ کیا اور دوسرے ہی سال حج بیت اللہ اور مقدس مقامات کی زیارت کو تشریف لے گئے جہاں سے واپسی کے بعد اگر کوئی تھوڑی بہت کسر تھی وہ پوری ہوگئی۔ تھانے داری کے زمانے کے خضاب کے کالے گل مچھے سفید براق ڈاڑھی میں اُتار لیے، ہاتھ میں ہزار دانہ تسبیح پکڑ لی غرض دنیائے ناپائیدار سے سیر ہو کر توشۂ آخرت جمع کرنے کے لیے مصلیٰ بچھا کر بیٹھ گئے۔

ناشتہ میں بادام، بالائی انڈے کھاتے، کھانے میں دودھ، بکری کا گوشت اور شیرینی وغیرہ مسنون۔ اغذیہ کا ایصال ثواب کی وجہ سے استعمال رکھتے۔ بہتر کے پیٹے میں تھے۔ مگر مضبوط توانا جسم، چنگاریاں چھوڑتی سی آنکھیں، انار کا دانہ سا رنگ، جھریوں دار چہرے پر دودھ، برف میں دھلی ہوئی مقدس ڈاڑھی سبحان اللہ کیا ہی نورانی بڑھاپا شیخ جی پر اللہ میاں نے اُتارا تھا۔ اور یہ وہ عزت و شہرت کہ آج ریٹائر ہوئے اتنی مدت گذر چکی تھی۔ مگر قصبہ قصبہ گاؤں گاؤں نوٹنکیوں میں۔ سلطانہ ڈاکو نامی ڈرامہ کھیلا جا رہا تھا اور نوٹنکی کے لونڈے شیخ جی کا روپ بھر بھر کے ترانے گاتے تھے اور اب تو خیر اکلِ حلال اور صدقِ مقال کے بھی بڑے عامل تھے اور منتظم اور جز رس ہمیشہ سے ہی رہے تھے۔ ورنہ پچھتر روپیہ ماہوار تنخواہ سے ریٹائر ہونے پر ایک لاکھ اکیاون ہزار کیسے بچا لاتے۔

اور اس زمانہ ملازمت کی ایک لاکھ اکیاون ہزار بچت میں سے کتنے شیخ جی کے اپنے گاڑھے پسینہ کی کمائی کے تھے اور کتنے اس آخری شادی کے جہیز میں سلطانہ کے پتلے خون کی کمائی کے پہنچے تھے۔ یہ حساب شیخ جی اور اُن کی نئی بیاہی سونے کی چڑیا شروع شروع میں تو شاید جانتی رہی ہو اور اب تو رقم تنخواہ اور رقم جہیز ایک دوسرے کو پہچان کر اس طرح گھلے مل گئی تھیں جیسے دو بچھڑی بہنیں، اور دونوں ایک ہو کر پاک تجارت میں لگ گئی تھیں۔ شہر کی اناج منڈی، ریٹ مارکیٹ کا ٹھیکہ، چنگی کے کوڑے اور کھنڈی کے پڑاؤ کا ٹھیکہ تو ریٹائر ہونے کے بعد کی پاک پیداواریں تھیں، لہٰذا بیوی کے نام تھیں۔ بازار میں ہیڈ کانسٹبلی کے زمانہ کی خریدی ہوئی بڑے بیٹے کے نام دکانوں کی قطار، سول لائن میں منجھلے لڑکے کے نام تھانہ داری کے زریں دور کی تعمیر کوٹھیاں، اور جگہ جگہ زرعی جائدادیں چھوٹے صاحبزادہ کے نام بٹیاں اور محال، شیخ جی چاروں کھونٹ بھرے پُرے تھے۔ اور سب کام بڑے لڑکے کے انتظام میں دے کر اللہ اللہ کرتے اور سب کی نگرانی مصلے پر بیٹھ کر کرتے۔ طبیعت ہر پہلو سے کارِ خیر کی جانب مائل تھی۔ محلہ اور آس پاس کی مظلوم عورتوں جن پر جنات یا ارواحِ خبیثہ کا سایہ ہو جاتا یا بھوت پلید پکڑ لیتا۔ یا جن کے بچوں کو چھل بل یا مسان دبوچ لیتا شیخ جی تیلتے دیتے۔ نئی بیاہی لڑکیوں کو جن کے نوجوان شوہر بے راہ ہوتے گنڈے تعویذ دیتے عملیات بتاتے اور راہ راست پر لے آتے۔ غرض کوئی بھی کیسا ہی مصیبت زدہ آجاتا تو اسے اور کچھ نہیں تو وظیفہ ہی بتا دیتے اور اگر کسی پولیس کانسٹبل یا تھانے دار کے خلاف رشوت ستانی اعانت جرم یا استحصال بالجبر کی کارروائی ہوتی تو وہ اللہ میاں کے بجائے سیدھا شیخ جی کو رجوع کرتا اور اسے تمام قانونی

ترکیبوں کے علاوہ شیخ جی کوئی مؤثر جلالی وظیفہ بھی بتاتے اور یہاں تک کہ مصیبت زدہ اگر ہندو ہوتا تو اُس کے لئے زوردار منتر بھی یاد تھے۔ اور کارِ منصبی کے سلسلے میں اگر کوئی پُرانے ساتھی تھانے دار، ہیڈ کانسٹبل کسی اہم کیس میں ان کی رائے طلب کرتے تو نہ صرف مفید قانونی مشوروں سے ہی نوازتے بلکہ پرانے اکھاڑے کے پٹھے باز استاد کی طرح داؤ پیچ بھی بتا دیتے، پھر حلقۂ اثر میں طوطے کی طرح پڑھے مادر زاد گواہ شاہدوں اور مقدمہ سازی کی کمی نہ تھی گوشے اور کھڈی کے پڑاؤ سے غلّہ اور سبزی منڈی تک ہر بازار کے شیر تھے لہذا وقت پڑے پُرانی وضعداری میں ثبوت کے گواہ بھی کرایہ کرا دینے میں مدد بھی کر دیتے اور مقدمہ سازی کے ذریعہ بھی کام بنا دیتے چنانچہ اس اہم معاملہ میں مشورہ کے لئے کوتوال صاحب اپنے پُرانے استاد شیخ جی کی خدمت میں حاضر ہوئے جن کی فیض تربیت سے وہ آج اس درجے پر پہنچے تھے اور اس قدیم شناسائے نفسیات جرائم اور جدید محرمِ رازِ قدرت، روشن ضمیر بزرگ نے سب روئداد سن کر کوتوال صاحب سے سوال کیا "کمشنر صاحب بہادر کے سائیس سے تو آپ کا سلسلہ ہوگا ہی ہوگا"

"جی کیا آپ نہیں جانتے، سلسلہ کیا تنخواہ ہی جو دیتا ہوں اور گھوڑی کا سب خرچہ ....."

"ہوں، ہوں، میں سمجھ گیا، تو پھر ٹھیک ذرا اسے میرے پاس لے آیئے اور میں اس سے ایک بات کرلوں ذرا۔ ویسے میں آپ ہی کو بتا دیتا مگر آپ شائد اسے ٹھیک سمجھا نہ سکیں" اور وہیں بیٹھے بیٹھے کوتوال صاحب نے کمشنر صاحب کے سائیس کو بلوا بھیجا اور شیخ جی آہستہ سے اطمینان کے ساتھ بولے "چلو اس وقت تو ٹلی . . . ."

اور دو روز میم صاحب کا خواب و خور حرام رہا۔ چھیوں اضلاع کے ڈاکٹر مویشی جمع ہو گئے، لیکن میڈم کلوڈیا نے اگلا سیدھا پاؤں زمین پر نہ ٹیکا۔ نہ ورم نہ چوٹ، مگر لنگڑی، مالشیں اور بھپارے سینک اور انجکشن سبھی کچھ ہوئے۔ سب بے سود، گھوڑی اصطبل کے اندر کھڑے ہی کھڑے تین ٹانگ کی رہ گئی۔ بیطاروں نے نظر کا اثر بتایا۔ تھوڑی بہت جھاڑ پھونک بھی کی گئی۔ مگر ٹس سے مس نہ ہوئی اور تیسرے روز میلے کی گھوڑ دوڑ بھی ہو گئی اور میچ جیت بھی گیا۔ اور جیت کو صبر کر کے میم صاحب گھوڑی کی خبر مانگنے لگیں۔ ہفتہ بھر کے بعد ایک بوڑھے ڈاکٹر مویشی نے جو مستقل طور پر گھوڑی کے لنگڑی ہونے کے بعد اصطبل میں ڈیوٹی پر تھا نعل بند کو بلوایا نعل بند نے نعل اکھیڑا تو انکشاف ہوا ایک ٹیڑھی کیل سم میں سے برآمد کی جو غالباً گھڑے کھڑے ٹاپیں مارنے کے سبب نال میں سے ڈھیلی ہو کر باہر آ گئی تھی اور پھر ٹیڑھی ہو کر کچے سُم میں گھس گئی تھی اور گھوڑی کے پاؤں کو بیکار کر دیا تھا۔ میڈم کلوڈیا چنگی ہو گئی اور کوتوال صاحب نے خوش ہو کر نعل بند کو ایک روپیہ انعام بھی دیا اور کوتوالی کے گھوڑوں کے کام کے علاوہ پولیس لائن کے سب جانوروں کے نعل ٹھوکنے کا ٹھیکہ بھی دلا دیا۔

اور اس وقت تو ٹل گئی اور بس ٹل ہی گئی تھی۔ شیخ جی کی ایک کرامت میں کوتوال صاحب کو ذرا سانس لینے اور سوچنے کا موقع مِل گیا تھا۔ کہتے ہیں کہ "ماتی بچے سَو برس کی عمر" مگر یہاں تو سو ہی دن کے بعد کوتوال صاحب کو پھر یہی دن کھڑا تھا بچہ زر سے ہاتھ نہ آسکتا تھا۔ زاری سے ہاتھ نہ آسکتا تھا۔ اور "بجزت پھندے" کے اور کوئی شکل ہاتھ آنے کی نہ تھی اور کوتوال صاحب کے ہاتھ میں ساری عمر پھندے ہی پھندے رہتے ہیں۔ تعزیرات ہند کے گورکھ دھندے میں پانچ سو بارہ پھندے تو لارڈ میکالے بنا کر ہر کوتوال صاحب کے ہاتھ میں دے گئے ہیں اور ان میں گانٹھیں اور پیچ لگا لگا کر کوتوال صاحب "نے نہ معلوم کتنے جال بن لئے ہیں اور ان جالوں کا پیچ پیچ اور گانٹھ گانٹھ شیخ جی کو ازبر تھی کیونکہ اپنے دور میں انھوں نے ان میں بے شمار اضافے کئے تھے۔ کوتوال نے ہر پھندا نکال نکال کر آزمایا۔ قتل، ڈکیتی، بغاوت، بلوہ، حبس بے جا اور کیا کیا اور شیخ جی کے مشورے کے لئے سامنے ڈالا۔ مگر بایں ہمہ چودہ سالہ پرانے پولیس کے ملازم ہونے کے باوجود بھی شہر اور متعلقہ علاقے کو کوتوال صاحب اتنا نہ سمجھے ہوئے تھے جتنا شیخ جی کی نظر میں تھا۔ اور سنگین سے سنگین اور پیچیدہ سے پیچیدہ پھندا شیخ جی کے نزدیک اوچھا تھا۔

اور شیخ جی ہمیشہ اُستادانہ تیوروں سے یہی کہتے رہے "ٹھیرو" اور ایک روز جب ایک نہایت ہی سنگین کیس قتل و ڈکیتی کا تراش کر کوتوال صاحب شیخ جی کے سامنے لے گئے، اور شیخ جی نے ایسے آہنی پھندے پر بھی وہی اپنی استادانہ "ٹھیرو ابھی" تو کوتوال صاحب جھلّا گئے۔ اُستاد آپ کی ٹھیرو نے مارا اور یہ وقت آ گیا اب وہ بار بار کاٹھ کی ہانڈی نہیں۔ چڑھے گی۔ اور تین مہینے بعد گھوڑ دوڑ سر پہ ہوگی۔ اور بوڑھے تجربہ کار ریٹائرڈ پولیس افسر نے کہا۔ عزیز القدر جتنی تمھاری عمر ہے۔ اس سے زیادہ میری سروس ہے۔ اور پھر تمھیں اس ضلع میں جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں اور یہاں باون ضلع رہتے ہوئے ہیں۔ اور پھر میں تو اسی ضلع کا باشندہ ہوں۔ اور چودھری کو چودہ پُشت سے لگا، اس لونڈے تک پہچانتا ہوں جسے بچو میاں کہتے ہیں۔ اوّل تو چودھری تھوڑی لکڑیوں کے پھینکنے کا نہیں، اور پھر یہ لونڈا۔ یہ بچو میاں نہیں۔ بچھو میاں ہے یہ باپ سے زیادہ قابو یافتہ ہے اور بڑا ہی خود سر۔ بس سمجھ لو کہ آج کا بچھو کل کا سانپ ہے۔ ابھی کالج سے نکل کر سیدھا نہیں ہو پایا ہے کہ لیڈری کی باگ ڈور پکڑنا چاہتا ہے۔ اور ان حالات میں اویس گڈھ تو بڑی چیز ہے اور قرب و جوار کے مواضعات کا بھی ذکر کیا، میاں ضلع بھر کے اندر چودھری کے خلاف ایک سچا گواہ بھی پیدا ہونا ناممکن ہے۔ اور اگر کسی بد مظنے، ہسٹری شیٹر کو پکڑ کر لاسیدھا عدالت تک تیار کر کے لے بھی جاؤ گے تو کون گارنٹی کر سکتا ہے کہ مجسٹریٹ کے سامنے اندر جا کر اُلٹی نہ الاپے، اور منہ کی کھاؤ۔"

"تو پھر کیا مطلب ہے آپ کا قبلہ یعنی پھر ۔۔۔ اس خوف میں کوئی پھندا پھینکیں ہی نہیں" کوتوال صاحب نے منہ چڑھے شاگرد والے مخصوص انداز میں کہا۔

نہیں میاں میرا مطلب یہ ہے کہ کوئی اوچھا پھندا پھینک دیا تو اُلٹا گلے پڑ جائے گا اور یہ لونڈا ہر چیز کو حتیٰ کہ یہ بھی کہ اس طرح پولیس والے کمشنر صاحب کی گھوڑی کو جتانا چاہتے ہیں اور نہ معلوم کیا کیا عدالت میں تمہارے ہی پیش کردہ گواہوں سے کہلوائے گا اور پھر سمجھ لو کہ معاملہ کس قدر خراب ہو جائے گا۔ اور کیا عجب کہ اخباروں تک نوبت پہنچے تو میرا مطلب یہ ہے کہ کمشنر صاحب بہادر پر آپ کی اس تمام سرگرمی کا اتنی بدنامی کے بعد کیا اثر پڑے گا۔؟"

"تو پھر کیا ہو استاد" کوتوال صاحب نے کہا۔ "ٹھیرو!" شیخ جی بولے اور کوتوال صاحب نے ذرا طفلانہ انداز بنا کر ناک کے ساتھ بسورتے ہوئے پھر کہا "بس، اُستاد" آپ کی "ٹھیرو" نے مارا، اور دیکھئے روز روز ایسے پھندے ہاتھ نہیں آتے۔ بڑا اُگٹھا ہوا کیس (۳۰۲) اور (۳۹۳) کا آج کل میرے ہاتھ میں ہے۔"

"میاں تم لڑکے ہو میں ڈرتا ہوں کہ اگر تم سنگین سے سنگین وار بھی دیہات میں چودھری پر کرو گے تو مُنہ کی کھاؤ گے اور اُس کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکو گے اور وہ خیر تمہارا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ مگر گندگی تو اتنی اُچھالے گا اور گھوڑ دوڑ کی بات کو اتنی شہرت دے گا کہ جو کمشنر صاحب اور ان کی میم صاحب کو میڈم گلوڈیا کے ہار جانے سے زیادہ کھلے گی اور وہ چودھری سے تو کچھ بھی نہ کہیں گے اپنی بدنامی پر بس تمہاری کمبختی لگا دیں گے۔"

"ہاں تو یہ تو میرے دماغ میں شروع سے ہی ہے کہ یہ کام نہایت خوبصورتی سے بہت خفیہ طور پر ہونا چاہیئے۔ لیکن اُستاد پھر آپ نے کیا سوچا ہے۔؟"

"ہم سوچے بیٹھے ہیں" اور ہم جانتے ہیں کہ یہ بھی معرکہ ہمارے ہی ہاتھوں انجام ہوگا۔ ویسے میاں تم دو سال سے کوتوال شہر ہو! پہلے تو تمہارے پاس اتنا دماغ نہیں کہ اتنی دُور کی کوڑی لا سکو اور اگر تمھیں سمجھا بھی دوں تو باوجود اپنی پوری کوتوالی کے بھی ہم سمجھتے ہیں کہ تم اس کے لئے مواد فراہم نہیں کر سکتے، اور وہ تو سب اِس جانب کے ہی ہاتھوں سر انجام ہوگا میاں۔"

"تو پھر بتائیے نا استاد" کوتوال صاحب نے ناز کے ساتھ ٹھنک کر شاگردانہ انداز میں کہا۔

"بتانا کیا تم دیکھ ہی جو لوگے، ایک مختصر بات یہ سمجھ لو کہ چودھری پر دیہات کے اندر تمھارا ہر جھوٹا سچا دارنا کام ہوگا اور حلق کی ہڈی بن کر اٹک جائے گا اور یہ مُرغا تو ہم جانتے ہیں کہ شہر ہی میں پھنسے گا اور یاروں کے ایک ہی جھٹکے میں بچہ کے باپ تک کو یاروں کے گھر باندھ جائے گا"

"کچھ تو بتاؤ استاد" کوتوال نے کہا اور پھر زانوئے ادب ساتہ کرتے ہوئے پہلو بدل کر بچوں کی طرح بھولے پن سے بولے "اور استاد ہم کچھ نہیں سمجھتے"۔

"اجی تم سمجھ جاؤ تو پھر اُستاد، اُستاد کاہے کے، جاؤ میاں تمھارا یہ کام ہمارے سر رہا لیکن اس مرتبہ ہمارا کام بھی ہو جانا چاہیے"۔

ہاں وہ آپ کے لڑکے کے سلیکشن کے متعلق میں پچھلے سال ہی کپتان صاحب کے کان میں ڈلوا چکا ہوں"۔

"لیکن ہوا تو نہیں، کپتان صاحب نے ضلع سے نام بھیج دیا اور وہاں کمشنر صاحب نے سونگھا بھی نہیں۔ اب پہلے کپتان صاحب، کلکٹر صاحب اور کمشنر صاحب کے درمیان یہ چیز طے کرا لیجئے۔ ضلع سے تو نام جائے گا ہی۔ تھانیداری کے سلیکشن میں کمشنر صاحب بہادر اس کو اپنا امینی رکھیں"۔

"لیکن دیکھئے تو استاد آپ تو جاننے والے آدمی ہیں۔ میں ایک چھوٹا سا افسر ہی تو ہوں۔ اور افسران بالا سے ایک مخصوص دائرہ کے اندر ہی کہہ سن سکتا ہوں" کوتوال صاحب نے کہا اور شیخ نے ذرا رکھائی کے ساتھ جواب دیا "جی نہیں جناب یہ جھول ہے۔ اور یہ باتیں آپ کسی اور کو بتائیں، ہوں! بقول شخصے۔ع "عمر گذری ہے اسی دشت کی سیاحی میں"۔ بہ خور دارا ایک جانب کانسٹبل سے چل کر تھانیداری تک پہنچے اور کوتوالی ہم نے بھی بہت دنوں کی ہے اور نہ معلوم کتنی مرتبہ ان کانوں پہ سے سلطانہ اور دھنیا اور علی شیر خاں جیسے ڈاکوؤں کی گولیاں سنسنا کر نکل گئیں۔ نہ معلوم کتنے مقدمے رشوت ستانی اور استحصال بالجبر کے ہائیکورٹ تک چلے اور چٹکیوں میں اُڑ گئے، آپ اُستاد مشرف الدین خاں کو یہ باتیں نہ بتائیے، کام کیجئے اور کام لیجئے"۔

"تو دیکھئے استاد میں کہہ تو سکتا ہوں اور وہ بھی کپتان صاحب بہادر سے"۔

اب کیوں کہلواتے ہو یہ باتیں اُس کو بتاؤ جو جانتا نہ ہوں۔ ٹھٹھیروں ٹھٹھیروں بدلائی نہیں ہوا کرتی کوتوال صاحب، اور آپ جو یہ روزانہ صبح تڑکے گھوڑے پر سوار ہو کر سَو روپئے جیب میں ڈال کر کپتان صاحب کے بنگلہ پر شہر کی خیریت سنانے جاتے ہیں۔ بس ایک روز روپیہ ہاتھ میں دیتے وقت میم صاحب سے کہیئے کہ یہ چیز طے کرا دیں"۔ خیر کپتان صاحب کے اور آپ کے درمیان ہم جانتے ہیں کہ دفتر میں پردہ رہتا ہے مگر میم صاحب صبح ہی صبح سَو روپئے کے نوٹ گنتے وقت تو روزانہ ننگی ہی ہوتی ہیں آپ کے سامنے، اور ہم تو اپنے زمانے میں جو جو خاص کام ہوا کرتے تھے اسی طرح پچھلے دروازے پر میم صاحب کے کان میں ڈال دیا کرتے تھے اور کپتانوں کے سامنے تو بجز سلوٹ جھاڑنے اور خیریت بتانے کے کوئی بات ہی نہ ہوتی تھی"۔

کوتوال صاحب کچھ جھینپے سے ہو گئے اور ایک گھونٹ سا لے کر شیخ جی نے پھر سلسلۂ کلام جاری کیا "اور ہمارے زمانے میں ایک گنی جایا کرتی تھی روزانہ کوتوالی سے، سستا زمانہ تھا اور بس جو بات ہوتی میم صاحب کو ذرا اشارہ دے دیا بس کام ہوا ہوا یا ملتا تھا"

کوتوال صاحب نے گہری سانس لی اور بولے "بہتر ہے۔"

"تو پھر جانیئے چودھری گو مع گھوڑے کے پھانس دینا ہمارا ذمہ ہے اور بغیر آپ کی جیب سے ایک پیسہ بھی خرچ ہوئے گھوڑا کھٹا کھٹ سرپٹ آئے گا انشاء اللہ تمہارے تھان پر اور پھر جو چاہنا کرنا، ایسا معاملہ سوچا ہے کہ پہلے تو عدالت تک نوبت ہی نہ آئے اور تمہارے ہی ہاتھ سے فیصلہ ہو۔ اور بفرض محال نوبت آبھی جائے تو پورے مقدمے کی ترتیب میرے ذمہ رہی، مگر دیکھئے سلکشن پہلے ہے اور ابھی اس کا انتظام ہو جانا چاہیے۔"

"بہت بہتر۔"

"تو پھر جانیئے لگام لگی سمجھ لیجئے۔ چودھری صاحب گھوڑا دیں اور ہاتھی کی ضرورت ہو تو ہاتھی دیں گھر بلا کر ــــــ"

شیخ جی نے شدید استادانہ انداز میں کہا اور کوتوال نے خوش ہو کر اپنے اُستاد کی جانب دیکھ کر ذرا احسان مندی اور سعادت مندانہ احساس کمتری کا اندازہ بتایا اور ایک دم ان کے ایام جوانی کی مہمات اور روایات یاد کیں جو آج تک سب نئے پرانے تھانیداروں میں زبان زد اور ضرب المثل تھیں اور شیخ جی نے اس کا اندازہ کر کے کہا "میاں کوتوال صاحب بہادر ماشاءاللہ حاکم وقت ہو، مگر ابھی لڑکے ہو اور ہم نے ساری عمر اس مدرسہ کی اینٹیں ڈھوئی ہیں جس میں تم آج پڑھ رہے ہو۔ عزیز القدر، پینتیس برس اس گلی کی خاک چھانی ہے اور بڑے بڑے ریاض کئے ہیں۔ تم اگر کوتوال شہر ہو تو آج اناج کی منڈی سے لے کر گھڈی گھوڑے کے پڑاؤ تک ٹھیکے دار ہم بھی ہیں۔ مگر میلہ سے پہلے پولیس ٹریننگ اسکول کا سلیکشن ہے اور بات پکی ہو کر سلیکشن کا پروانہ ہمارے ہاتھ آجانا چاہیے جب بات بنے گی۔"

"سمجھ لیجئے اُستاد ہو گیا آپ کا لڑکا، تھانہ دار"، کوتوال نے کہا اور چل پڑے اور چلتے چلتے شیخ جی نے کہا "تو پھر کوتوال صاحب سمجھ لیجئے کہ گھوڑا ابھی آپ کے تھان پر بندھا ہے۔ چاہیں دوڑانا اور دوڑا کر گھٹانا یا قصائی سے کٹانا ــــ" اور بار بار ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ "بس آج تیرہ ہو گئی اور اگلے مہینے کی تیرہ تک گھوڑے کی باگ ڈور تمہارے ہاتھ میں ہوگی۔ انشاءاللہ"، شیخ جی نے اُستادانہ تیور وں سے زیادہ "دلیرانہ" انداز میں کشف کے زور سے کہا۔ اوبیں گڈھ شہر سے سات میل کے فاصلہ پر تھا اور چودھری شہر ایسے ہی آیا جایا کرتا تھا، جیسے دیہاتی چودھری آیا جایا کرتے ہیں اور رات گذارنے کا نو سال میں تین ہفتے کے سوا موقع ہی نہ ہوتا تھا۔ جب نمائش لگا کرتی تھی اور ضلع کے اور سب رئیس زمیندار تو نمائش میں کیمپ لگاتے تھے مگر چونکہ چودھری چھوٹی چودھرائن کو ساتھ لایا کرتا تھا لہٰذا ایک دیہاتی ٹھاکر دوست کا خالی مکان جو شہر میں اسی غرض کے لئے مخصوص تھا کہ دیہاتی دوست احباب۔ عدالتوں اور مقدمہ بازیوں کے سلسلے میں آکر قیام کیا کریں۔ نمائش کے پورے مہینے چودھری کے لئے ہمیشہ سے عارضتاً ریزرو رہتا تھا اور نمائش کا قیام ہمیشہ سے اسی میں ہوتا چلا آیا تھا۔ شہر میں نمائش لگی ہوئی تھی۔ چودھری۔ چھوٹی چودھرائن لڑکے، نوکر چاکر سب مقیم تھے۔ سیر و تفریح، خرید و فروخت ہو رہی تھی، چودھری تو خیر شام کے وقت گھنٹہ دو گھنٹہ کے لئے گھومنے کو جایا کرتا اور اپنے شہری دیہاتی دوستوں کے ساتھ تھوڑی بہت تفریح خرید و فروخت کر کے چلا آتا۔ مگر لڑکے اور ان کے نوکر چاکر صبح کے نکلے کہیں رات کے بارہ کے اردگرد پلٹتے ــــــ دن بھر چودھری، چودھرائن، ایک بوڑھی ما ما اور ایک نوکر مکان پر رہتے اور اس لق و دق مکان کی تنہائی میں تمام دن چودھری، چودھرائن دن دھاڑے کچھ چڑیا چڑوں کی نقل دُہراتے تھے۔ اور خلوت کے مزے لوٹتے اور ہر سال نمائش کا پورا مہینہ گویا ہنی مون میں گذارتے۔

ساڑھے گیارہ بجے دن کا وقت تھا، لڑکے بڑا ناشتہ کر کے نوکروں کے ساتھ نکل گئے تھے اور چودھری چودھرائن ذرا سی بجے

کے گھسے گھسے ابھی غسل خانہ سے ساتھ ساتھ غسل کرکے برآمد ہوئے تھے اور چودھرائن دھوپ میں بیٹھی بال سکھا رہی تھیں۔ چودھری کنگھی کرکے اور گل مچھے چڑھا کر فارغ ہو چکا تھا اور چودھرائن کا تماشا دیکھ رہا تھا نیچے کی منزل میں ماما کھانا پکا رہی تھی کہ چودھری کے کان باہر سڑک پر سے آتی ہوئی مختلف آوازوں پر چونکے اور چودھرائن سے پوچھا۔ "بلّا (ملازم کا نام) باہر مردانہ میں ہے نا؟"

اور چودھرائن نے بال جھاڑتے ہوئے نیچے سر جھکائے ہی جھکائے کہا۔ "ہاں ذرا ابھی پان لانے بزار گیا ہے شاید۔" اور چودھری کے کان پھر آوازوں کی جانب چونکے اور وہ آہستہ سے اُٹھ کر مردانہ زینے کی جانب سے چپ چاپ اُتر گیا اور خاموشی کے ساتھ پھاٹک کے کواڑ کی آڑ میں کھڑا ہو کر سڑک کی آوازیں سُننے لگا۔

"اور پھر بوڑھا! جوان جہان پوت پوتوں والا۔"

"یہ ڈاڑھی یہ کرتوت۔"

اور چودھری نے محلے کی مسجد کے پیش امام کی آواز پہچانی جس کے پیچھے وہ ظہر عصر کی نماز مسجد میں جاکر پڑھا کرتا تھا۔ "کیا ہوا بھائی نبو خاں، کیسا شور تھا۔"

"ارے کیا بتاؤں، ملاں جی چودھویں صدی ہے چودھویں، ارے یہ پہلوان بیٹھے ہیں اور ہم ایک بیڑی جلا کر پوری نہیں پی پائے ہیں کہ وہ بھنگی نکل کے گیا ہے، جھاڑو بغل میں لئے پھاٹک میں سے اور جب تک اندر بھنگیا پٹک دی۔ جانی کا رنے زنانی کا رنے۔"

"ارے یہی تو آواز سُن کر میں حجرے سے نکلا کس نے، کس نے!؟" ملاں جی نے ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"چودھری ...... اوں، آں ــــ ہاں ملاں جی، جی بھیا وہ تو چودھری کا نام لینی گئی ہے کھلم کھلا۔ ہم سب بیٹھے ہیں کیوں جی لالہ۔"

"ہوں" چاٹ کے خوانچے والے نے کہا۔ "بورو جمانو (برا زمانہ) ہے آدمی کی نیت جرا (ذرا) دیر میں ڈگت ہے۔ چاہے تنا ہیں بنائے پائے ہیں کہ بھنگی نکلا ہے جد لو (جب تک) بھیتر دے پٹکی، پھر بھیا چودھری ہی جو ٹھہرو، جو کرے سہاتا ہے۔ کل جگ ہے کل جگ ــ"

"چھ چھ چھ!!! قرب قیامت ہے۔" پیش امام نے کہا۔

"اجی یہ اوپس گڑھ تھوڑی ہے کہ آج بھنگن پکڑی کل چمریا، مزہ آجائے گا جی!"

اور چودھری، بجھا ہوا دیہاتی زمیندار تھا، اوپر سے کچھ سن گن پاکر ماتھا ٹھنکا تھا چپکے سے اُتر کر نیچے آیا تو سڑک کی آوازوں سے سمجھ گیا کہ کوئی پھندا آنے والا ہے بنگو کی طرح دماغ ناچنے لگا اور کواڑ کی آڑ سے باہر قدم نکالنا چاہا مگر حرکت پیچھے کو ہوئی اور پلٹ کر مردانہ مکان کا صحن پار کرکے اندر آیا۔ نیچے کی منزل میں ماما روٹی پکا رہی تھی۔ ہکلاتی آواز میں پوچھا۔

"ابھی یہاں سے بھنگن گئی ہے کما کر۔"

"ہاں میاں ذرا دیر ہوئی، گئی تو ہے۔" ملازمہ نے جواب دیا۔

اور چودھری کی آواز سن کر بالاخانہ سے چودھرائن بولیں "ہاں میاں! یہ تو میں آج جمن میاں (بڑا لڑکا) سے کہنا بھول ہی گئی کہ بنارس کی دکان کی خبر لائے گا آئی اب کی آئی کہ نہیں، سُنتے ہو شام کو ذری نگاہ ڈال لیجو، پھر میں اس کی دلھن کا بھورا جس دن

زنانی ہو گی خود جاکر تیار کرلاؤں گی۔ مرزاجی کی بہو کے ساتھ اور ہاں ذری یہ تو بتاؤ۔ اور ہو گی کس دن زنانی ؟ اور پارسال کو تو میری دولھن آپ اگر پسند کرے گی اپنے اور میرے لئے سینتے ہو جی ؟ آج سب خبر دو، لڑکے اپنی چکڑی میں ہیں، مجھے کوئی خبر نہیں دیتے۔"

اور چودھری پھر چکرا کر چپ چاپ باہر چلا گیا۔ اور پھاٹک کے سامنے سے اس کے چکراتے ہوئے سر اور بھنبھناتے ہوئے کانوں میں ٹیلیفون کی سی آوازیں آئیں "نچے پن کی حد ہو گئی۔"

"توبہ توبہ! اور وہ سیدھی گئی ہے کوتوالی اور اس نے خالی نشست گاہ میں نظر کی، دل میں اور جھنجلایا۔ خدا غارت کرے اس نمک حرام بلاگو! غائب ہے! کچھ خبر ہی لاتا باہر سے کیا طوفان ہے! اور اتنے میں ملازم اُفتاں و خیزاں متوحش کپکپاتا ہوا آیا اور جیسے دم بخود۔ مالک کا چہرہ دیکھنے لگا۔ گویا منتظر ہے کہ سرکار کچھ پوچھیں، اور چودھری نے اس کی جانب ایسی نگاہوں سے دیکھا کہ کچھ کہے۔ اور ملازم تھرائی زبان سے بولا۔ میاں! وہ! میں میں تو ابھی ذرا ڈھولی لینے چلا گیا تھا۔ سو باہر نہ معلوم کیا باتیں ہوں۔ وہ۔ ان ۔۔۔"

بات بتاؤ کیا بلا ؟ ؟ !"

نہ معلوم کیا کیا، اول فول بک رہے ہیں۔ سب لوگ کہ وہ تو کوتوالی گئیں!

"ایں ۔۔۔! کون! کون" چودھری نے کہا۔

"جی ہاں میاں مہترانی" ۔۔۔ اور چودھری کی جانب مشتبہ نظروں سے دیکھا۔ اور ملازم نے نہایت سادگی سے کہا "پھر میاں اسے جانے ہی کیوں دیا۔ پھاٹک بند کیوں نہ کر لیا آپ نے۔"

"اوخو کیا بکتا ہے!" چودھری نے جھنجلا کر کہا۔

"خبر بھی ہو کسی کو"

اور نوکر نے کہا "ہاں میاں دیکھئے نا ۔۔۔ میں تو اس بھنگی کو جھاڑو لگاتے چھوڑ گیا تھا اور بھنگنیا مجھے پھاٹک پر گھستی ملی، ڈلیا لئے اور باہر محلہ والے اور خوانچے والے نہ معلوم کیا کیا بک رہے ہیں ۔۔۔ وہ روتی پیٹتی نام لیتی گئی ہے سرکار کا"

اچھا تم پھاٹک بند کردو" اور ملازم پھاٹک کے کواڑ تک پہنچا ہی تھا کہ رُک گیا اور یک دم کوتوال صاحب درجن بھر کانسٹبلوں کے ساتھ اندر گھس پڑے اور چودھری کے گرد ماشینی انداز میں حلقہ کر لیا، سناٹا اور گھبراہٹ! چودھری ہکا بکا رہ گیا، بڑی شکل سے حلق پہ زور دے کر آواز نکالی "اوں، آں! کیا! کہئے کہئے! اور خائف نگاہ چاروں طرف ڈالی' اور کوتوال صاحب بہادر نے کہا "آپ کے خلاف مسماۃ سندریا، زوجہ بدھا خاک روب نے الزام دفعہ (۳۷۶) تعزیرات ہند کے تحت 'زنا بالجبر' کی رپورٹ گذرانی ہے اور آپ زیر حراست ہیں!" زمانے کے سرد و گرم دیکھے ہوئے بوڑھا چودھری جو پہلے سے خطرہ کی کچھ بُو بھی سونگھ چکا تھا، بدحواس سا ہو گیا اور گھونٹ سا لینے لگا ۔۔۔ "کوتوال نے نرمی سے کہا، آئیے، اچھا پہلے آپ ایک گلاس پانی پی لیجئے اور چلئے وہاں بیٹھ کر اظہار دیجئے"" اور چودھری بڑھ کر نشست گاہ میں چوکیوں پر بیٹھ گیا۔ اور سپاہی اِدھر اُدھر کھڑے ہو گئے۔ کوتوال صاحب نے مونڈھا گھسیٹ لیا، ملازم نے جلدی سے ایک گلاس پانی دیا، اور چودھری نے جلدی سے ایک گھونٹ لیا اور کوتوال صاحب نے اطمینان سے ڈائری کھولی اور پولیس والے مخصوص منشیانہ انداز میں قلم ہاتھ میں سنبھالتے ہوئے پھر اسی لہجے میں دُہرایا ۔۔۔ "آپ کے خلاف مسماۃ سندریا زوجہ بدھا خاکروب نے الزام دفعہ (۳۷۶) تعزیرات ہند کی رپورٹ

درج کرائی ہے کہ آپ نے اس کے ساتھ نشست گاہ کی بغلی کوٹھری میں ارتکاب زنا بالجبر کیا، آپ کیا جواب دیتے ہیں؟ ـــــ اور چودھری "لاجواب" سا تھا۔ اندر سے ماما نکل آئی تھی۔ دوڑ کر ایک زقند میں اوپر پہنچی اور چودھرائن کو خبر سنائی اور پلٹ کر چپکے سے چودھرائن کا حکم نوکر کو سنایا کہ بہت جلد نمائش سے لڑکوں کو بلا کر لائے۔

اور جب چودھری نے بہ مشکل نفی میں حلق پر پورا زور دے کر آواز نکالی، تو کوتوال صاحب نے چند منٹ توقف کیا: اور اتنی دیر میں مسماۃ سندریا زوجہ بدھا خاکروب مستغیثہ بھی ہسپتال سے ڈاکٹری معائنہ سے فارغ ہو کر آ گئی اور چودھری غریب نے آج پندرہ دن کی رہائش میں اس وقت پہلی مرتبہ اس شوخ چشم، دیدہ دلیر، قطامہ مدعیہ کو دیکھا جس نے اس پر آج مدعا علیہ ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ مسماۃ کے بیانات چودھری کے روبرو رپورٹ کی لفظ بلفظ تائید میں ہوئے کہ وہ نشست گاہ میں جھاڑو لگا رہی تھی۔ اور چودھری یہاں بیٹھا تھا۔ چودھری نے اس سے اس کوٹھری میں جھاڑو لگانے کو کہا، اور جب وہ اندر پہنچی تو پیچھے سے دبے پاؤں خود پہنچ گیا، اور اسے پکڑ کر زمین پر گرا لیا...... وغیرہ وغیرہ۔ اور اس کے شور مچانے پر رمو چاٹ والا، اور ننھو امرودوں والا آ گئے جو پھاٹک میں تھے۔ اور جب ان دونوں نے شور مچایا تو اور بہت سے آدمی گلی میں سے اندر آ گئے۔ اور چودھری اسے چھوڑ کر علیحدہ ہو گیا ـــ اور کوتوال صاحب نے ایک کانسٹبل کو اشارہ کیا، اور پھاٹک کے سامنے سے ننھو امرود والا، رمو چاٹ والا، ننھو خان کبابی، جمن پہلوان، الٰہی بقر قصاب اور فقو حمال سب گواہوں کو بلایا۔ اور کوتوال صاحب نے ان میں سے دو تین معزز گواہوں کے سامنے اندر جا کر موقع واردات کا معائنہ کیا۔ اور جگہ جگہ فرش پر بکھرے ہوئے "آخری اودھ ہاتھ نایاب" جن کی شانِ نزول ثبوت واردات کی اہم شہادت تھی۔ کھرچ کھرچ کر مع تھوڑی تھوڑی فرش کی پپڑی کے نہایت احتیاط کے ساتھ ایک ڈبیہ میں جمع کر لئے اور باہر آ گئے۔ ہسپتال کی رپورٹ معائنہ دیکھی اور قیافہ شناس کوتوال گھستے ہی بھانپ گیا تھا اور پھر کھائے کے گال اور نہائے کے بال یوں بھی نہیں چھپتے ہیں اور یہ تو اس کے علم میں تھا کہ چھوٹی چودھرائن ساتھ ہیں۔ اور گھر میں چودھری، چودھرائن اکیلے ہیں۔ چودھری کو تازہ غسل کئے دیکھ کر بیدار مغز، تجربہ کار پولیس افیسر نے مزید زندہ ثبوت فراہم کرنے کی امید موہوم میں اندھیرے کے اندر چلتے چلتے ایک تیر پھینکا اور ضابطہ میں خانہ تلاشی کا حکم دیا اور نیچے کی منزل کی تلاشی یوں ہی چلتی پھرتی لے کر بالاخانہ پر پہنچا اور اپنے قیافہ کی چولیں بٹھانا غسل خانے میں گیا، چودھری اور چودھرائن کے ذرا دیر پیشتر کے اتارے ہوئے کپڑے ملے جلے پڑے تھے۔ ان میں سے چودھری کا پائجامہ علیحدہ کیا۔ اور سیون سیون بغور دیکھ کر چودھری کی "ذات" کے مزید دھبے مارک کر کے گویا تحقیقات کی مسل کا پیٹ بھر دیا۔ پائجامہ اور ساتھ لے آیا اور دھبے نیچے کی واردات کے ثبوت پر چسپاں کر دیئے اور پھر سب نشست گاہ میں جمع ہوئے ایک کانسٹبل کو اشارہ کیا۔ اور اس نے اپنے جھولے میں سے بھنگن کا لہنگا برآمد کیا: جو ارتکابِ جرم کے وقت مسماۃ کے جسم پر تھا اور اس کا ایک پلندہ بنا کر فولاد خاں کانسٹبل نے "روبرو گواہان پیر بخش ولد الٰہی بخش جولاہہ، دھرمی ولد سوہن کاچھی اندر احاطہ دفتر کوتوالی لاکھ بتی سے سیل مہر کر دیا" اور پھر چودھری کے پائجامہ اور جائے وقوعہ کوٹھری سے کھرچ کھرچ کر جمع کئے ہوئے موتیوں کی ڈبیہ کا ایک پیکٹ بنا کر "روبرو گواہان کرٹے سنگھ کانسٹبل سے لاکھ بتی سے سیل مہر کرایا" اور پھر دونوں بنڈل ایک پلندے میں جمع کر کے عدالت میں اگزیبٹ "اے، بی، سی، بنا کر ثبوت میں پیش کرنے کے لئے کیمیکل اگزامنر کے پاس بھیجنے کو تیار کر دیئے۔ اور فرد تلاشی پر گواہانِ تلاشی کے دستخط لے لئے۔ سب کام مکمل کرنے کے بعد ذرا تحکمانہ انداز میں سپاہی سے کہا۔ "ہتھکڑیاں چڑھاؤ" اور چودھری صاحب سے تشریف لے چلنے کو کہا ـــــ بدحواس چودھری نے لڑکوں کا انتظار کرنے کو کہا مگر وہ مجبور تھے کیوں کہ عدیم الفرصت تھے لیکن چودھری کے بار بار کہنے پر بیچارے کو وقت نکالنا ہی پڑا۔ اس فرصت کے وقت

میں کوتوال صاحب نے چودھری کی ہتھکڑیوں کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اور کانسٹبل ہٹا دئے اور تخلیہ میں معاملہ دانی بات ہوئی اور چودھری نے ہزار دو ہزار تین ہزار تک نوبت پہنچادی، مگر سب پر لات مار کر کوتوال نے صرف گھوڑا طلب کیا، اور تھوڑی سی رد و کد کے بعد چودھری کو ہاں کرنی ہی پڑی۔ مگر لڑکوں کے مشورہ پر معاملہ مشروط رہا۔ لڑکوں کی آمد تک سب کچھ اسی طرح ٹنگا رہا اور ہتھکڑیوں کا قفل بدستور رہا۔ یہاں تک کہ لڑکے بھی آگئے۔ نوکر سے معاملہ کا خلاصہ تو نمائش ہی میں معلوم ہو گیا تھا، باپ کو اس ہیئت کذائی میں دیکھ کر چھمّن میاں اور بچّن میاں دونوں بڑے تو درکنار، منہ زور اور بیباک بچّو میاں بھی ایک دفعہ کو گھبرا گئے مگر بیٹوں کے آتے آتے باپ کی ہتھکڑیاں کھل گئیں اور مشورہ کے لئے اندر جانے کی اجازت بھی مل گئی۔ ہتھکڑیاں کھلوا کر چودھری تینوں بیٹوں کے ساتھ زنانخانہ میں گیا۔ چودھرائن بھی بڑھاپے میں روز روشن کی خلوتوں کے سب رومان بھول کر بالاخانہ سے نیچے اتر آئی تھیں اور بیچاری استغفار پڑھ پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے گناہوں کی معافی اور اپنے شوہر کی عزت مانگ رہی تھیں اور گھڑی گھڑی ماما سے باہر کی خبریں منگا رہی تھیں۔ شوہر کو آزاد دیکھ کر غصہ میں لال بھبھوکا ہو گئی۔ یہ بھی نہ خیال کیا کہ جوان بیٹے ساتھ ہیں، بولیں "ہی بڑیں تب بے مردُوے تمہارے نوج کی! کیا کہوں نگوڑا شیطان ذرا دیر میں ڈگاتا ہے۔ اچھے بھلے بس ۔۔۔ اور میں موئی ڈھی کاٹی تو بال بھی نہ سکھا پائی ہوں ابھی نہا کر اور نہ معلوم کس وخت (وقت) بلی کے سے پاؤں واں پہنچ گئے اور وہ خصم پیٹی گوکی بوٹ بھگنیاں دبوچ لی بس ۔۔۔۔ خدا بچائے موئے شیطان سے! ۔۔۔۔ پھر بے بے مردُوے تمہاری نیت کو کیا کہوں ؟" اور چودھری مظلومیت کے ساتھ رو پڑا اور بیٹوں کی جانب رحم طلب نگاہوں سے دیکھ کر گویا آنکھوں ہی آنکھوں میں پوچھا "کیا تم بھی میرے متعلق ایسا گمان کر رہے ہو؟" اور چودھرائن کچھ اور بھی کہتی مگر چھمّن میاں نے جھلا کر کہا، اتی جان بس چپ بھی رہئے۔ نہ سمجھیں نہ بوجھیں بات کرنے دیجئے ذرا، اور چھمّن میاں کی اتی بیچاری کیا سمجھتیں۔ جب ابا ہی غریب کی سمجھ میں کوٹھری کے اندر بکھرے ہوئے گوہر ہائے نایاب کی تازہ شانِ نزول معمّے سے کم نہ تھی جو ٹیچ پٹیچ چودھری کے خلاف ثبوت کے بے بہا موتی کوتوال صاحب کے ہاتھ لگے تھے۔ اور جن کی وجہ نزول چند منٹ پیشتر کوچہ بغل میں دبائے پھاٹک سے نکلتے ہوئے بھنگی کے ہی علم میں تھی۔ پھر چند منٹ بعد جھنجھنی چلاتی گندگی اُچھالتی پھاٹک سے نکلتی بھنگن کے علم میں تھی اور سب سے پہلے شیخ جی کے دماغ میں آئی تھی اور لڑکے بیچارے تو ابھی خیر نمائش سے بھاگے ہوئے آرہے تھے۔ اگر چودھرائن بیچاری ناقص العقل نے شوہر کے چند منٹ کے غائب ہو جانے اور اندر سے باہر جانے پر وہی کچھ لیا جو بہت دنوں سے کوتوال صاحب دل میں سمجھے ہوئے تھے تو بیچاری کا کیا قصور، چودھری غریب چودھرائن کے اخلاقی و مذہبی لکچر پہ جیسے مجرم کی طرح مظلوم سا بن کر رہ گیا۔ غریب نے عاجزی کے ساتھ دانت نکال کر مستفسرانہ انداز میں پھر بیٹوں کی جانب دیکھا، اور پھر نگاہوں سے پوچھا "کیا تم بھی ایسا ہی سمجھ رہے ہو؟ جو تمہاری ماں کہہ رہی ہیں؟" مگر سعادت مند بیٹوں نے شاید باپ کی لغزش پر اسے زیادہ محجوب نہ کرنے کے خیال سے اپنی ہی نظریں جھکالیں اور چودھری نے بڑی مشکل سے الفاظ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر اپنی آج کی پاک دامنی پیش کی جس پر بیٹوں نے یک زبان ہو کر کہا "چھوڑئیے ابا جان! اب یہ بتائیے کہ آپ نے کیا طے کیا؟" اور جب چودھری نے اپنے جرم کا خوں بہا، بچہ بتایا تو بڑے بیٹے نے اس پر یک دم منظوری دے دی، اور منجھلے نے تائید کی مگر بچّو میاں بہت جز بز ہوئے۔ منطق اور نفسیات کے اسکالر تھے، کچھ دیر بحث کی اور جب بڑے بھائی نے جرم کے سنگین ہونے کی جانب توجہ دلائی تو انھوں نے ثبوت کے کمزور ہونے کا عذر پیش کیا اور جب بڑے بھائی نے ثبوت کے متعدد گواہوں کی طرف توجہ دلائی تو بچّو میاں نے کہا کہ اول تو ان چھ چھ پیسے کے گواہوں کی عدالت میں وقعت کیا! اور پھر ہم انھیں دو دو آنے میں توڑ توڑ کر الٹی اپنی کہلوا سکتے ہیں، تو آخر میں پھر چھمّن میاں کو کہنا ہی پڑا کہ میاں جب تک دو دو آنے کے گواہوں نے اُلٹی

کہلوا کر آپ کے بوڑھے باپ عدالت سے چھوٹ کر گھر آئیں گے اُس وقت تک کتنی مرتبہ سفیدی میں کالک لگے گی۔ تم بچے ہو اتنی بات نہیں سمجھتے۔" اس پر منطقی نوجوان نے کہا۔ "جب ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارا ضمیر پاک ہے تو کوئی کچھ کہے ہماری سفیدی میں کالک کیسے لگ سکتی ہے۔؟"

بڑے مجن میاں جو دونوں بھائیوں کے مکالمے خاموشی سے سُن کر اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہے تھے ایکدم بول پڑے۔ "چپ رہو بچو میاں، تم گدھے ہو، موقع محل نہیں سمجھتے۔ اسی کی طرح اپنی لگائے پڑے ہو، دیکھو میاں پہلی چیز تو یہ ہے کہ جنگ دو سر وارد، میں مان لی تمھاری کہ مقدمہ عدالت سے یقیناً چھوٹے گا، ضلع سے نہ سہی ہائی کورٹ سے اپیل میں، لیکن میاں مقدمہ تو مقدمہ ہی ہے۔ جج زد تو آپ نہ ہوں گے اور اس وقت یہ معاملہ یہیں پر آپ کی مرضی کے مطابق طے ہوتا ہے اور ابھی چھوٹتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ آپ سمجھا کریں کہ آپ بے گناہ ہیں اور پاک ضمیر خیال کر کے سچی تسکین دیا کریں دل کو، دنیا تو نہیں جانتی جتنے مُنہ اتنی باتیں، میاں مرغی کو تکلے کا گھاؤ بہت ہوتا ہے۔ عدالت ابتدائی سے ہائی کورٹ تک پہنچنا تو بڑی بات ہے یہاں سے کوتوالی جانے ہی میں ہم سب کو ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ وہ تو ایک ٹھپہ ہے۔ اگر آج ہم تینوں بھائیوں میں سے کسی کو خطِ غلامی لکھنا پڑے تو بھی بہت سستے چھوٹے، ورنہ ابھی تو بات اس کمپونڈ تک ہے اور سہ پہر تک سارے شہر میں، ساری نمائش میں اور کل یا دن ضلعوں میں ادھر ادھر ہو جائے گی اور میاں سب منطق اور فلسفہ بھول جاؤ گے کسی کو مُنہ دکھانے کی جگہ نہ رہے گی۔" اور بچو میاں کچھ سُست سے پڑ گئے اور بولے۔ "اچھا آغا بھائی یہ بتائیے کہ بچہ دے کر ہزاروں لاکھوں آدمیوں سے مُنہ کالا نہ ہوگا ان سے کیسے نبٹیں گے؟ اس سے کیسے چھوٹیں؟"

اور چھمو میاں ذرا تیز آواز میں بول پڑے۔ "ارے اماں جان دیکھتی ہیں آپ ان مڑی صاحبزادہ کی تقریر! مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس لونڈے کا دماغ واقعی خراب ہو گا، یعنی کہاں سے بول رہے ہیں۔ آپ بھی لو اس وقت برابر کے پلے میں کیا چیز رکھی ہے آپ نے، چھ چھ چھ، تمھاری عقل۔ افسوس ہے۔"

اِدھر چودھرائن ایک دم بول پڑیں۔ "کیا ہم ان ہزاروں لاکھوں کے غلام ہیں، نگوڑوں کے؟ کیا گھوڑا ان کے باپ کا ہے؟ ہماری گھوڑی کا بچہ ہمارا گھوڑا ہے..... نگوڑے چھٹے سر چڑھ جائے ہیں۔ دو دو کوڑی کے۔ ہوں۔ میرے اللہ کے بڑے بڑے یار دُھنے جولاہے اور منہار ـــــ مُفت کی گھوڑ دوڑ مچا رکھی ہے۔ پہنچ لوں گھر دیکھوں گی تم کتنے لاڈلے ہو، دادی اماں کے بہت بھروسے رہے ہو۔ لیک کو جو پھٹکے دوں ڈیوڑھی پہ موئے ننگے تو۔ باپ کو ہتھکڑی پڑی ہے اور بیٹے تیس مار خاں لیڈر بنے مونچھیں اینٹھے پھرتے ہیں۔"

اور بچو میاں نے ماں کی آواز تو ایسی ہی سُنی مگر ابھی چند منٹ پیشتر والی باپ کی جھریوں دار کلائیوں میں ہتھکڑیاں پہنے ہوئے تصویر نگاہ میں گھوم گئی۔ ادھر مجن میاں نے کہا۔ "میاں ان سے بھی نبٹیں گے خوبصورتی کے ساتھ اور آپ کی ہم نبٹیں گے اور سب کو راضی رکھیں گے۔ وہ ہمارے ہیں اور ہم ان کے۔ ہماری ذلت اُن کی ذلت ہے اور ہماری عزت اُن کی عزت۔ بس وقت اس بلا کو ٹالو۔ یہ پٹھان کا بھی قرض نہیں، مرہٹوں کی چوتھ ہے۔" اور جب تک باہر سے تقاضا آیا۔ بچو میاں مُنہ لپیٹ کر پڑ رہے اور چودھری اور دونوں بیٹے باہر گئے۔ کوتوال صاحب کیل کانٹے سے ہر طرح تیار ہو کر آئے تھے۔ رسید کا اسٹامپ تک جیب میں ڈال کر لائے تھے۔ بچہ کی رسید فروخت "بالعوض ایک ہزار روپے نقد سکہ چہرہ شاہی" بحق شیخ مشرف الدین تحریر ہو گئی۔ اور چودھری سچ مچ چھوٹ گیا۔ اور شام تک ادلیس گڑھ سے بچہ پکڑ کر قید فرنگ میں آ گئے۔ اور شیخ جی کے تھان پہ اور کوتوال صاحب کے اخراجات پر اپنے پاؤں چل کر خود بندھ گئے۔ خیریت گذری اور چودھری نئی زندگی پا گیا اور خاندان ڈوبتے ڈوبتے بال بال بچ گیا۔

اور اب تو کوئی بات ہی نہ تھی۔ آج سے ہی میدان ہاتھ تھا اور بچہ کی راسیں تین مہینے پیشتر سے پنجے میں آگئی تھیں۔ کوتوال صاحب، کلکٹر صاحب اور کپتان صاحب کے سامنے پکی چھاتی ٹھونک رہے تھے کہ میڈم کلوڈیا جیتے گی اور در میدان بچہ کو ہرا کر جیتے گی، اور دہلی کے ڈربی کی چیمپین بنے گی اور بجز چند ہستیوں کے کسی کو سکا نوں کان خبر نہ تھی۔ کوتوال صاحب سے لگا میم صاحب تک سب مطمئن تھے مگر بچو میاں دل ہی دل میں بَل کھا کر رہ جاتے اور اپنی مجبوری پر بعض اوقات سب کچھ اُلٹ پھینک کر مرنے مارنے پر تل جانے کو جی چاہتا تھا۔ گر حالات میں اس وقت مُنہ کھولنے کی گنجائش نہ تھی اور انھیں بھی باپ بھائیوں کے ساتھ اپنے مُنہ نے تمام کسانوں میں یہی کہنا پڑا۔ چونکہ بہت نامی گھوڑی سے مقابلہ ہے، اس لئے بچہ کو خاص ٹریننگ کے لئے ایک دوست کے یہاں شہر بھیج دیا ہے۔ شہامت خاں اُستاد کو کسی نے کوئی بات تو بتائی نہ تھی، مگر بوڑھا تجربہ کار چابک سوار سمجھ سب کچھ گیا تھا۔ ساری عمر کوتوالوں اور رئیسوں میں جو کٹی تھی بس مالک نے جو کچھ کہہ دیا اس پر خاموشی کے ساتھ یقین کئے ٹھنڈی سانسیں بھرتا۔ تمام کسان نت نئی افواہوں سے ڈر رہے تھے کہ دیکھو کس کروٹ اونٹ بیٹھے۔ شہر سے لے کر دیہات تک خاص و عام کے اندر اس دوڑ کا انتظار و اشتیاق سال بھر سے تھا اور گھوڑ دوڑ کے لئے گھڑی گھڑی گن رہے تھے۔ سات سمندر پار کی آئی ہوئی ولائتی گھوڑی کا نو گھوڑ دوڑیں جیتے ہوئے دیسی گھوڑے سے مقابلہ تھا دونوں میں سے کسی کی پُشت پر روایات کسی سے کم نہ تھیں اور یہاں تک کہ میلا لگا اور چودھری کے وعدہ کے مطابق کوتوال صاحب نے استاد شہامت خاں سے حسب معمول مطابق دستور بچہ پر سوار ہو کر دوڑانے کی تحریک کی اور گھوڑ دوڑ سے دو روز پیشتر بلا کر خاص ہدایات دیں خیران کے سامنے تو اُستاد بیچارے ہوں ہاں کر کے اپنے مُنہ نہ سہی ان کے مُنہ سے وعدہ کر آئے مگر پُرانی وضع کے آدمی چابک، لگام، آسن، رکاب کے سچے جاگی شہ سوار، اور پھر جس بچہ کو وہ موت کے مُنہ سے چھڑا کر، کوڑے کے ڈھیر پر سے بھوکا پیاسا پکڑ لائے، جسے بچہ ہی سمجھ کر پالا اور پھر جسے بیٹے کی طرح تربیت دے کر اور ران تلے لے کر نو تربہ چھ ضلعوں کے راجپوتوں پٹھانوں کو جیتا آج اسے یک دم آغوش سے نکال کر ذبح کرنے کو کیسے آمادہ ہو جاتے۔ کوتوالی سے پلٹ کر چودھری کے سامنے عذر کیا مگر چودھری نے اپنے وعدے کے پاس میں زور دے کر آمادہ کرنا چاہا تو سات پُشت کی چودھری کی نمک خواری اور بارہ برس کی سرکاری ملازمت سے دست برداری پیش کی اور جب چودھری نے اپنی بات اور عزت کا حوالہ دیا تو چُپ ہو گئے لیکن ساتھ ہی ساتھ اپنے بڑھاپے کی ضعیفی کا حوالہ دیتے ہوئے اپنی کلائیوں کی کمزوری اور بچے کی معذوری کا اس اہم تناؤ کے لئے اندیشہ بھی ظاہر کیا جس کے لئے کوتوال صاحب انھیں آمادہ کر رہے تھے۔ مگر چودھری پھر بھی اپنی ہی کہتا رہا اور اُستاد کو مجبوراً وعدہ کرنا پڑا اور حسب مرضی نتیجہ کی گارنٹی دینی ہی پڑی مگر بھلا ہو وہ دیمر کا جس نے بر وقت دست گیری کی اور اب تک جو کچھ عذر لنگ تھا۔ سچ مچ لنگ بن گیا۔ اور شام تک چودھری نے کوتوال صاحب کو اطلاع دے دی کہ استاد یک دم در دِ کمر کے دورے میں مبتلا ہو گئے اور اب وہ جاکی کا انتظام خود کر لیں۔ اور کوتوال صاحب نے ایک نئے جاکی سدن خاں کی خدمات گھوڑ دوڑ سے دو روز پیشتر حاصل کر لیں۔ جو کھینچنے تلنے میں بہت سی شہرتیں پائے ہوئے تھا اور ان دو دن کے اندر ہی تین چار سواریاں لے کر اس نے بچہ سے اپنا آسن بھی مانوس کر لیا اور شناسائی بھی حاصل کر لی۔

یوں بھی میلا ہی بہت بھاری لگا تھا اور اس مرتبہ تو ولایتی گھوڑی اور دیسی گھوڑے کی بھاگ کی شہرت تھی۔ دور دور کے کسان آئے تھے جو کبھی نہ آتے تھے اس مرتبہ وہ بھی موجود تھے۔ چھیوں اضلاع کے کلکٹر اور سب ڈپٹی کلکٹر پولیس کے اعلیٰ عہدہ دار اور دوسرے محکموں کے چھوٹے بڑے آفیسر اضلاع بھر کا ایک ایک دیہاتی رئیس، زمیندار اور شہر کے رؤسا، سب اپنے اپنے کیمپ لگائے پڑے تھے اور رات دن ہر خاص و عام کی زبان پر یہی موضوع زیر بحث تھا۔ ہر کسان بچہ کو ہمارا بچہ کہہ کہ بچہ کی بات کرتا اور سویلین

میم ڈم کلوڈیا کو "اور میٹر" کہہ کر پکارتے اور زمیندار طبقہ بھی وقت سولینوں میں "حاضر باش خدمت" ہوتا تو میڈم کلوڈیا کو "ہماری گھوڑی" ہی کے پُر خلوص مخطاب سے یاد کرتا۔ مگر جب آپس میں بیٹھتے تو نہایت فن کارانہ انداز میں بحثیں ہوتیں اور میڈم کلوڈیا کمشنر صاحب کی گھوڑی ہوتی اور بچہ چودھری کا گھوڑا پکارا جاتا۔ مگر پچھلے نو میدانوں کے روندے ہوئے زمیندار توڑ مروڑ کر بحث کی میزان بچہ کی ہار پر ہی لگو اتے اور چودھری اور ان کے دونوں بیٹے چھمن میاں اور مجن میاں اگر موجود ہوتے تو وہ بھی خندہ پیشانی سے کڑوا گھونٹ لے کر تائید کرتے۔ قہر درویش بر جان درویش۔

اور آج بھاگ کا دن تھا۔ گنگا کنارے دریا برار مٹی کے نم اور ذرا اچھور سے میدان پہ لاکھوں آدمی جمع تھے۔ ایک جانب کسان اکٹھے ہو رہے تھے۔ ہر ایک دو دو اُپلے بغل میں دبائے ایک ایک تھیلی تمباکو کمر میں لٹکائے چلا آ رہا تھا۔ دوسری جانب سیولین گروپ تھا۔ اور ان کے برابر ہی زمیندار رؤسا کا ہلکا پھلکا شبک سا مجمع تھا۔ حکام کرسیوں پر تھے اور ان کے سیدھے ہاتھ پر زمینداروں کی لمبی چوڑی دریاں، قالین، مسندیں اور تکیے لگے ہوئے تھے۔ خوشبو دار تمباکوؤں، پانوں اور عطروں سے فضا بسی ہوئی تھی۔ یہاں سے وہاں تک بات بات پر نقرئی قہقہوں کی جل ترنگ سی بج رہی تھی اور طلائی مسکراہٹیں چمک رہی تھیں۔ مست خوشبوئیں اور شوخ رنگینیاں بکھری ہوئی تھیں۔ چودھری اور دونوں بڑے بیٹے اپنی شایانِ شان جگہ پر بیٹھے ہوئے تھے مگر بچو میاں کھوئے کھوئے گنہگار سے اپنے بھاری غول میں تھے۔ بچو میاں کا غول لاکھوں کسانوں کا اکٹھ۔ میدان پر سروں ہی سروں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر جس میں اب تک برابر دریا آ آ کر مل رہے تھے۔ جہاں جگہ جگہ اُپلوں کے الاؤ سُلگ رہے تھے۔ خانہ ساز تمباکو کے ڈھیر تھے۔ ٹولیوں میں چلموں کے دھوئیں کے اندر گرما گرم بحثیں ہو رہی تھیں اور بڑے جوش اور یقین کے ساتھ بچہ کی جیت پر میزان لگتی تھی۔ سیولین اور زمینداروں کی سوسائٹی میں میڈم کلوڈیا کی پیڈگری اور نجابت پر بحث تھی کہیں دو چار افسروں اور زمینداروں میں بات ہوتے ہوتے سات اور سات چودہ پُشت اوپر تک جا پہنچی اور اور کہیں پر چودھویں پشت سے اُتر کر میڈم کلوڈیا تک آجاتی اور چونکہ میڈم کلوڈیا اور بچہ کے سیاہ و سفید کی ملکیت معین ہو گئی تھی۔ لہٰذا مالکوں کے چہروں پر اطمینان کی گہری چمک تھی۔ اِدھر بچو میاں کے چہرے پر کسی کسی وقت ایسی بدحواسی کے آثار دکھائی پڑتے جیسے چودھری کے چہرہ پر اُس روز تھے۔ جب کوتوال صاحب نے اُسے گرفتار کیا تھا اسے محسوس ہو رہا تھا۔ کہ اپنی عزت کا گلا اپنے ہاتھوں گھونٹ رہا ہو اور جیسے وہ آج روہیلکھنڈ بھر کی ساکھ کا قاتل ہے اور سب کا خائن۔ ۔۔۔۔۔۔۔

اور میم صاحب اور کمشنر صاحب بہادر لیڈیز اور معزز عہدہ داروں کے جلوس میں تشریف لائے۔ سب کی نظریں اُٹھیں چھوٹے اضلاع کے یوروپین و نیم یوروپین" افیسران کی گوری گندمی، چھپکلی کے پیٹ کے رنگ والی پیلی، بھوری مٹیالی بیویوں کے علاوہ اور بہت سی ہم رنگ گوری اور نیم گوری، مہمان سہیلیاں بھی تھیں جو اس نازک مہم کے تماشے کے لئے دُور دُور سے مدعو کی گئیں تھیں۔ اور انگلستان سے روہیلکھنڈ تک رنگین سلسلہ ملا رہی تھیں۔ اور دور ہی سے دیکھ کر زمیندار طبقہ اپنی اپنی نشست پر مؤدب کھڑا ہو گیا۔ آفیسروں نے کرسیاں چھوڑیں۔ چند ڈپٹی کلکٹر اور تحصیلدار ادھر سے اُدھر دوڑتے نظر آئے اور ان کے پیچھے پیچھے ہر نوروز کی لسٹ میں خطابات کے ساتھ نام ٹٹولنے والے کچھ زیادہ مستعد زمیندار بھی لپکے۔ مہمانوں آنکھیں بچھا کر ہاتھوں ہاتھ لیا کرسیاں اور صوفے پیش کئے۔ دو ایک کلکٹروں کی ذہنیتوں کچھ لٹی تو شادی "قسم کے کوٹ پتلون پہننے والے آنریری مجسٹریٹ نسل کے زمینداروں نے لیڈیز کی آمد کو تیز کرنے کے لئے نمایاں پھرتی دکھائی اور اگلی نشستوں پر سب کو حسب مرتبہ بہ آرام بٹھایا۔ اور چونکہ زمینداروں کی نشست افیسروں کے سیدھے ہاتھ پر قریب ہی تھیں کلکٹر صاحبان اور کمشنر صاحب بہادر کی آمد پہ مسندوں اور قالینوں پہ حُقّے خاموش ہو گئے۔ سگریٹ بجھ گیئں۔ پان مُنہ میں دبا دبا کر چبائے جانے لگے۔ باتیں سرگوشیوں میں ہونے لگیں۔ اور قہقہے بند ہو گئے اور کہیں کہیں

جو ایک بات بچہ کی تعریف کا پہلو لئے نکل جاتی تھی، اس کی جگہ بھی میڈم کلوڈیا نے لے لی۔

یوں تو میلہ ہی سرکاری ہوتا تھا۔ ویسے دوڑ کا کل خرچ، کپ اور جاکی کا تمغہ اور دیگر اخراجات بالعموم کسی آنریری مجسٹریٹ یا خطابات تورونہ کے بھوکے امیدوار زمیندار کے سر رہتا تھا جس کو اکثر گھوڑ دوڑ میں بھی کوئی خاص دلچسپی نہ ہوتی تھی۔ مگر آج تو سب زمیندار طبقہ کی دلچسپیاں میڈم کلوڈیا پر مرکوز تھیں۔ بچہ کے تو دوڑوں کے ہرائے ہوئے زمینداروں کو بغض ہیں اور بقیہ سب کو خوشنودی مزاج کلکٹر صاحب ہیں۔ اور یہ کوئی باضابطہ سائنٹیفک قسم کی (مغربی وضع کی) ریس تو تھی نہیں ایک بڑے دیہاتی میلے کی تاریخی گھوڑ دوڑ تھی۔ جس کی ابتدا رو میلہ دور سے ہوئی تھی اور خاص پہلو یہ تھا کہ اس میں گھوڑے گھوڑے بن کر بھاگتے تھے۔ جوئے کی شین اور قماربازی کی بساط کے مہرے نہیں ہوتے تھے۔ اور شریک اور تماشبین سب کے سب خالص اسپورٹنگ اسپرٹ کے تحت حصہ لیتے تھے۔ اور جب سے میلے کے انتظام پر گورنمنٹ نے خاص توجہ دی تھی اس کے بعد سے ہر سال دو سال پیچھے رفتہ رفتہ گھوڑ دوڑ کی قدیم روایات کو کچھ ترمیم و تنسیخ کے ساتھ ماڈرن انداز میں ڈھالا جا رہا تھا۔ ویسے دفتر میں ہر دوڑنے والے "جانور" کا نام مالک کا نام اور پتہ برسوں سے رجسٹر میں درج ہوتا تھا لیکن اس مرتبہ دفتر میں نام و پتہ لکھا کر ہر سوار کو ایک ٹکٹ بھی دیا جاتا تھا جسے لے کر سوار میدان میں آتا تھا۔ اور دوڑنے سے پہلے اور صف میں لگتے وقت یہ ٹکٹ چیک بھی ہو رہا تھا۔

اور گھوڑے گھوڑیاں میدان میں ایک ایک دو دو کر کے اترنا شروع ہوئے کسی رئیس کی دو برس پہلے کی لائی ہوئی "بجلی" بے حیائی کے ساتھ کوندتی اور کسی کا پچھلے میلہ کا پٹا ہوا "پرندہ" منہ زوری سے بل کھا کھا کر ہنہناتا تھوڑا الف ہوتا۔ کسی کا اکڑوں۔ "مور دیج" شرارت کے ساتھ کان پیچھے کو چپکا چپکا کر آہستہ آہستہ حلق سے مرمراتا اور الف ہوتا۔ رگ رگ سے نئی سج دھج دکھاتا چلتا۔ کسی کی "بچھیری" بل کھا کھا کر اداؤں کے ساتھ بکھرتی سمٹتی۔ بٹلتی۔ اٹھلاتی پاؤں کے اندر جیسے زمین کو لپیٹتی سی چلتی اور چاروں طرف تماشائیوں میں ایک ایک کو پہچان کر تبصرہ ہوتا مگر ہر ایک کی نگاہیں میڈم کلوڈیا کی منتظر تھیں اور کلوڈیا کے تذکرہ کی تان بچہ کے نام پر ٹوٹتی رہی۔ نیا جانور بنظر احتیاط اس دوڑ میں بجز میڈم کلوڈیا کے اور کوئی اتارا ہی نہ جا رہا تھا۔ ورنہ ہر دوڑ میں دو چار نئے جانور اترا ہی کرتے تھے۔ پرانے سب آ چکے تھے۔ قدیم دیہاتی رواج کے مطابق نئے جانور کو دوڑ میں سب سے آگے کھڑا کیا جاتا تھا اور پچھلے میلے کی دوڑ جیتے ہوئے کو سب سے پیچھے، بقیہ سب درمیان میں جدید انگریزی قاعدے کے مطابق قد اور لمبائی کے تناسب سے آگے پیچھے دوڑانے کا کوئی قاعدہ نہ تھا سب "جانور" میدان میں اتر چکے تھے۔ میڈم کلوڈیا کا نئے شوق میں اور بچہ کا پرانی عقیدت میں تماشائیوں کو شدید انتظار تھا کہ میڈم کلوڈیا دفتر سے ٹکٹ کٹا کر میدان میں آتری سب سے پہلے لیڈیز کی سیٹیں جھماپڑیں۔ "ہیر کمز میڈم کلوڈیا" ــــــ میڈم کلوڈیا" ــــــ اور تالیوں کی سنہری۔ روپہلی جھنکار کے ساز پر میڈم کلوڈیا نے باڈر کے اندر قدم رکھا۔ اور رقص سا کرتے ہوئے قدموں پر گوری تالیوں کا ساز بجتا رہا اور میڈم کلوڈیا میدان میں نظر آئیں، پیٹھ پر ہز ہائینس سے لے کر کمشنر صاحب بہادر تک عظیم روایات کا پہاڑ اٹھائے ہوئے فرانس اور انگلستان کی پیڈگری سرٹیفکٹوں کا پلندہ بنی ہوئی میڈم کلوڈیا میدان میں کیا اتری کہ عظمتوں سے سارا ماحول بھر گیا۔ کانوں سے لے کر دم تک ریشمی جالی سے ڈھکی ہوئی چال چلنے سے زیادہ رقص سا کرتی ہوئی آگے آگے زرق برق سائیس اس کے بعد اکسفورڈ فون اینگلو انڈین جاکی امونیشن بوٹ پہنے، رائیڈنگ برجیس پر ہاگ لیدر گیٹرس، چڑھائے، اسپورٹنگ کلر کی چست جیکٹ پہنے، سر پر سرخ رومال باندھے اور جس وقت میدان کے بیچوں بیچ میڈم کلوڈیا

کی پیٹھ پر پڑی ہوئی ریشمی جالی علیحدہ کی گئی تو جیسے ریس کورس چمک اُٹھا۔ گھوڑی تھی یا تصویر! جو رتیور۔ بڑی پیکر۔ آتھوں گانٹھ کمیت۔ آنکھوں میں سحر، ہونٹوں پر اعجاز، نتھنوں پر طراری، کنوتیوں پہ شوخی، آواز میں فوجی بینڈ والی جھنکار، چار تھرکیاں کسی بالی وڈ کی نازنین کی طرح لیتی تو دو قدم کسی مشرقی ملکہ کے انداز میں ڈالتی۔ ایک حرکت میں کان سے لے کر دم تک بجلی سی لہرا جائے تو دوسری میں سم سے لے کر پشت تک بانکپن کے ساتھ فولاد سا لپک جائے۔ شاہ گام میں بھی مختر خیزیاں اُبلیں اور شرارے سے چٹخیں۔ میڈم کلوڈیا تھی کہ ولایتی سانچے میں لپٹی ہوئی آگ کی پوٹ یا بارود کا تودہ، جولا مکھی کی پھٹتی سی چوٹی! طاقت اور تیزی کا حسین مجسمہ! ہر حرکت و رونگٹا رذنگٹا تربیت اور پرورش کے سانچے میں ڈھلا ہوا۔ سات اور سات چودہ پشت سائینٹیفک اصولوں پر پلی ہوئی جیسے یورپ کی "اسپ ساز" فیکٹری نے ایک کہربائی، مشین تراش کر بھیجی ہے۔ جس میں صانع قدرت نے تمام چلتے ہوئے فتنے دوڑا دیئے ہیں۔ اور میڈم کلوڈیا جس کی کئی کئی نانیاں، خالائیں، بھائی، بہنیں، ڈربی ریسیں دوڑ چکی تھیں، بصد ناز و انداز گورے ہاتھوں کی تالیوں کے سُریلے نغمے میں اپنی مقررہ جگہ پر جا پہنچی اور تماشبینوں کی آنکھیں حیرت و محویت میں کھلی رہ گئیں۔ خاص طور پر یہ چیز جاذب نظر تھی کہ کلوڈیا کے انداز میں نئے میدان تک اندر پہنچ کر اجنبیت بالکل نہ تھی اور یہ تو صرف کوتوال صاحب اور جاکی ہی جانتا تھا کہ چھ مہینے سے میدان سے مانوس کرانے کے لئے روزانہ کلوڈیا کو اسی میدان میں پریکٹس کرائی گئی تھی ورنہ تماشائیوں نے تو اس کے اس انداز کو بھی حسنِ تربیت پر محمول کیا۔

اور سب سے پہلے کہیں دور دفتر کے قریب پاڈلوئن پر بڑھتے ہوئے "میاں بچہ" نے اپنی شیر کی سی مخصوص ہنہناہٹ میں گرج کر اپنے مخالفین کو ہمیشہ کی طرح چیلنج کیا جسے سُن کر ایک ایک پُرانا پٹھا ہوا مدمقابل غصہ میں بھر کر زور سے ہنہنا پڑا اور بعض بعض نتھنے پھلا پھلا کر زمین پر اگلی ٹاپیں مارنے لگے ادھر بچہ کے میدان کے اندر اترتے ہی فلک شگاف نعرہ سے آسمان گونج اُٹھا۔ "مرد ہیلا صنف ڈنرلیشس جیتے رہو" "بچہ۔ بیر بڑھے رہو" ——— اور ہر جیکارے کا بچہ نے اپنی صدائے بازگشت جیسی محبت بھری آواز میں استقبال کیا۔ اور ہر جانب سے آوازیں اُبلنے لگیں، اور بچہ جیکاروں کی جانب مُنہ اُٹھا اُٹھا کر جواب محبت دیتا گونج کے اندر اینڈتا ہوا بڑھتا رہا۔ جوں جوں اپنے حامی کسانوں کے قریب تر ہوتا گیا۔ خوبصورت کنوتیاں بدل بدل کر اور بھی زیادہ بانکپن کے ساتھ پاؤں اُٹھاتا گیا۔ اِدھر جیکاروں کا جوش و خروش بڑھتا گیا۔ اُدھر ہنہناہٹوں سے گرما گرم استقبال ہوتا رہا۔ اور بچہ ہمہ گیری اور وقار کے ساتھ شاہ گام چلتا ہوا متکبرانہ اور مغرورانہ انداز میں اپنی نو دفعہ کی جانی پہچانی مقررہ جگہ پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ اور جس وقت لال قند کی گوٹا ٹنکی پرانی ملگجی گلتنی اتاری گئی تو تین مہینے کے "تھان مانے" اکاڑی پچھاڑی سے لگے پیدائشی اسپ گشتہ کے مرمریں تن و توش پر قید و بند والا گھناؤنا پن نظر آیا اور سفید مخمل سا روئنگا میلا میلا بگڑا بگڑا۔ جسم بھی دُبلا اور ٹانگیں بھی لمبی لمبی سی معلوم ہوئیں۔ مگر آنکھوں میں وہی چمک دمک اور تیوروں میں وہی دم خم تھا جو ہمیشہ میدان دیکھ کر ہوا کرتا تھا۔ اور کسان تو پیار بھری نظروں سے دیکھتے رہے مگر بچو میاں کے پریم بھرے تن اپنے بچپن کے پیارے کھلونے کو دیکھ کر چھالے سے پڑتے تھے۔ خون کے سے گھونٹ کی طرح آنسو پی کر انھوں نے زہر بھری نگاہیں اُستاد سدن خاں پر ڈالیں اور بچہ کے ایک جانب استاد سدن خاں چابک سوار جیس کاٹ پیجامہ پر پٹیاں کسے دیسی جوتا پہنے کباڑی کے یہاں کا فوج کا نیلامی کوٹ ڈالنے سر پر کڑی بندش کا صافہ باندھے کھڑے تھے۔ ایک ہاتھ میں فتح پوری کوڑا لہرا رہا تھا۔ دوسرا ہاتھ بچہ کے پٹھے پر پھیر رہے تھے۔ دوسری جانب ایک میلا سا سائیس ایک کثیف جھاڑن لئے آہستہ آہستہ بچہ کی گردن پر مل رہا تھا۔ اور بچو میاں کو ایسا معلوم ہوا کہ دونوں بچہ کو ایسی نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ جیسے بقر قصاب مذبح لے جاتے وقت

گائے پر ڈالتا ہے۔

ایک ایک جانور کی تمام شرائین جیسے کہربائی جھٹکے سے جھنجھنا اٹھیں۔ ایک دم میدان کوندتی بجلیوں سے بھر گیا۔ پٹاخہ چلا اور دوڑ شروع ہو گئی۔ دُمیں لہرا کر پیچھے کو پھیل گئیں، گردنیں آگے کو تن گئیں، کان اوپر کو آ گئے اور جانوروں کے جسم بھرپور کھنچ گئے۔ اور جیسے زمین پاؤں میں سمٹنے لگی، ہوا میں لچھے سے پڑنے لگے۔ ہر جانور جان توڑ کر پوری تیزی سے دوڑنے لگا تماشائیوں کی نگاہوں کو تعاقب کرنا مشکل ہو گیا۔ میڈم کلوڈیا اپنی مخصوص سائینٹیفک ریس دوڑی، اور بچہ اپنی نرالی جبلت کے مطابق چلا۔ بچہ کو اس میدان میں مدتوں سے دوڑ کے قاعدے کے مطابق پچھلی ریس جیتے ہونے کے سبب پیچھے سے اسٹارٹ مل رہا تھا اور اختتام پر اپنے حریفوں کو کبھی آدھا اور کبھی تہائی راؤنڈ پیچھے چھوڑتا ونگ پوائنٹ پر پہنچا کرتا تھا۔ پہلے راؤنڈ کا دو تہائی فاصلہ ذرا کم رفتار کے ساتھ تقریباً سب کے پیچھے طے کیا کرتا تھا۔ پھر بقیہ ایک تہائی میں سب کے دوش بدوش جا پہنچتا تھا اور دوسرے راؤنڈ کے آخیر تک آگے والے جانوروں سے کنوتی ملا لیتا تھا۔ اور تیسرے کے شروع ہی سے غضب ڈھانا شروع کر دیتا تھا۔ اسٹارٹ کے دس دس بیس بیس گز بڑھے ہوئے مدمقابلوں کو یہ بھاؤ پیٹتا۔ یہ جا وہ جا! تماشائیوں کی آنکھیں پھٹی رہ جاتیں۔ گھوڑا ہے یا چھلاوا۔ دیکھنے والے انگشت بدنداں رہ جاتے۔ ہار جیت میں انچوں اور فٹوں کا حساب نہ تھا۔ ونگ پوائنٹ پر کبھی آدھا چکر کبھی تہائی چکر آگے پہنچتا! اور اس جیتے ہوئے فاصلہ میں اُستاد شہامت خاں چابک سوار ڈھٹائی کے ساتھ مڑ مڑ کر دیکھتے جاتے تھے۔ کہ قریب ترین حریف کتنی دور پیچھے ہے۔ استاد سدن خاں کی ران تلے پہلے راؤنڈ کا تین چہارم حصہ تو بچہ ٹھیک چلتا ہوا معلوم ہوا۔ مگر جب اس راؤنڈ کے اختتام تک اپنی مقررہ ترقی نہ کر سکا تو مجمع میں بیچینی کے آثار پیدا ہوئے اور دوسرے راؤنڈ میں کسانوں نے سوار کے ہاتھوں اور راسوں پر غور کیا اور بچے کا ردوں کے ساتھ جگہ جگہ آوازیں بلند ہوئیں: "چھوڑو اُستاد باگ چھوڑو!——ڈھیل دو!——راسیں چھوڑو اُستاد!——" مگر استاد چھوڑنے کی بجائے اور الٹی قید کر رہے تھے اور بچہ کسانوں کی جوشیلی باڑھوں (ہمت افزا آوازوں) کے زور پر دوسرے چکر کے نصف تک بمشکل درمیان کے جانوروں تک پہنچ سکا اور میڈم کلوڈیا گولی کی طرح سب سے آگے اُڑی چلی جا رہی تھی۔ آناً فاناً میں تیسرا راؤنڈ شروع ہوا۔ بچہ نے پوری طاقت سے دوڑنا اور استاد نے پوری قوت سے روکنا شروع کیا۔ اور یہ دیکھ کر کنارے پھیلے ہوئے کسانوں میں بھونچال سا آ گیا۔ دُور تک سارا مجمع زیر و زبر ہونے لگا منچلے اور بلنگے نوجوان دیہاتی مدھے پھرٹ کا پھٹر کا کر بار ڈر لائن تک پہنچ گئے اور سب نے سب کچھ اندازہ کر لیا اور سب کسان سمجھ گئے کہ ان کا برسوں کا بنا بنایا کھیل بگڑ گیا اور مدتوں کا جیتا میدان آج سازش کا شکار ہو رہا ہے۔ بوڑھے کسانوں نے اپنی پھٹی ہوئی بھدی آواز میں بچہ کی ہمت بندھائی، اور "شاباش بچہ بیر! واہ بیر! لے گیا بازی، بچہ! بچہ! بچہ! مار میدان!" اور جوان اُستاد سدن خاں کی بدمعاشی پر آپے سے باہر زخمی شیر کی طرح بپھرے پڑتے تھے۔ "ڈھیل دے! او سدنا نمک حرام! حرامی بچے ہاتھ مار!" اور بار بار لاٹھیاں اُٹھانے لگے۔ "تچھر دیں ماس بھر دیں سگے" اور اولیس گدٹھ کے نوجوان تو آپے سے باہر تھے اور سدن خاں کی ماں کا رشتہ لارڈ میکسن اور سر کیمپل سے ملا ملا کر ولدیت میں استاد سدن خاں کے نام کے ساتھ لگا رہے تھے۔ جواب یکدم ذرا سی دیر میں استاد سدن کے بجائے "سدنا حرامی" کے معزز لقب سے چیخ چیخ کر پکارے جا رہے تھے۔ چاروں طرف میدان کے تین چہارم سے زیادہ باڈر پر کسان لگے ہوئے تھے اور جب دکھن کے محاذ والوں سے گذر کر جانور پچھم والوں کے محاذ میں پہنچے تو ادھر کے کسانوں نے بھی بڑے زور سے گرج گرج کر بوچھاڑ کی اب او سدنا سالے! آج تیری ہڈیاں توڑ دیں گے!

نمکحرام! سور کے ــــــ! لاٹ صیکسن کے .... کھوپڑی بھان دیں گے" حرامی بچے" اور بوڑھوں کی نرم آوازیں بدستور یکساں رہیں، صرف لہجہ میں شدت اور جے کاروں میں درشتی پیدا ہوگئی" بہت اچھے! بہت اچھے! بچہ واہ واہ بیٹا! ہاں ایک زور بچہ!۔ اے لپک کے میری جان ــــــ! بچہ! بچہ! بچہ۔ ــــــ ہاں ڈگ بڑھا کے! واہ بیٹا! میرا بیر! ــــــ جیو بڑھو" اور بچہ کی گردن دوسرے راؤنڈ کے نصف ہی سے راسوں کے تناؤ میں دُہری ہونا شروع ہوگئی تھی۔ کسانوں کا مجمع امید و بیم میں اچھل اچھل کر گلا پھاڑ کر چیخ رہا تھا۔ اور تیسرے راؤنڈ کے نصف پر تو بچہ لقا کبوتر بن گیا۔ کان چابک سوار کے چہرے تک پہنچ گئے اور دُم دُوہری ہوکر چونری کی طرح پٹھوں پر لہرانے لگی۔ نوجوان کسان بھونکتے ہی رہے۔ اور جوں جوں گھوڑے نے دم خم زیادہ دکھائے سدن خاں اتنا ہی زیادہ ڈھٹائی سے تانتا گیا۔ نوجوانوں کی گالیاں اور دھمکیاں شدید تر ہوتی گئیں۔ بوڑھوں کی ٹمکاریاں اور ہمت افزائیاں تیز تر ہوئیں۔ مگر استاد سدن خاں کے ہاتھ تنتے ہی گئے اور فتح پوری کوڑا مفلوج عضو کی طرح جھولتا لٹکتا رہا۔ محاذ سے گزرتے ہوئے نوجوان کسانوں نے بڑے زور زور سے بچہ کیا کہنے! مار میدان! اے لپک کے میری جان!" فلک شگاف نعرہ مارا اور جیسے زمین نے سکڑ کر اپنی طنابیں کھینچ لیں، مگر بچہ کا منہ میڈم کلوڈیا کی دُم تک ہی پہنچ سکا۔ اور باگیں تیز تر ہوئیں۔ زمین تھرا اگئی اور بچہ کے پاؤں پر لچھا سابن کر لپٹ گئی۔ اُستاد نے پوری طاقت سے کھینچا۔ بچے کے انداز سے معلوم ہوا کہ جیسے اس کی روح جسم کے اندر سے اُچھل کر آگے نکلنا چاہتی ہے جبلت سے بغاوت پر آگیا اور چابک سوار نے جتنا زیادہ روکنا چاہا اتنا ہی زیادہ تیز ہوا اور دُم سوار کے سر پر ناچنے لگی۔ اور گردن مور کی طرح دُوہری ہوکر کان سوار کی ناک کو چھونے لگی اور راسیں کھنچتی رہیں۔ رفتار بڑھتی رہی۔ اور تیسرے راؤنڈ کے نصف سے بچہ میڈم کلوڈیا کی کوکھ سے کنوتی ملاتے جارہا تھا۔ اور اب محاذ کے نوجوان کسانوں نے بھی، استاد کی گالیاں اور دھمکیاں بند کر کے بچہ کو بارڈر لائن سے باہر با ہر دوڑ دوڑ کر باگیں دینی شروع کیں۔ اور گردن کے اوپر چمڑے کے فیتے کا پورا کھنچاؤ ختم ہوگیا! منہ کے اندر لوہے کے ٹکڑے پورا دباؤ دے کر ڈھیل چکے اور کمشنر صاحب کے بازوے کو توال صاحب تک کے پنجے تک کا زور سب کچھ سدن خاں کی کلائی پورا کرچکی تو وننگ پوائنٹ دیکھ کر بچہ کچھ ایسا بیتاب ہوا کہ یکدم میڈم کلوڈیا کی گردن سے کنوتی جا ملی اور جس وقت وننگ پوائنٹ کے قریب کھڑے بچو میاں نے کڑک کر بچہ کو للکاری دی تو جیسے زمین ابتدائے آفرینش کی گردش کے خلاف ایک پھرکی آلٹی لے گئی۔ گویا سوج کے بجائے بجلی کے محور پر گھوم گئی! نگاہ کی شعاع کی رفتار سے آسمان الٹ کر نیچے آیا۔ اور زمین اچک کر سر پر پہنچ گئی! اور تھر بائی تڑپ سے بچو میاں کی آواز پر بچہ نے سر سے پاؤں تک جکڑے ہی جکڑے چمک کر ایک اُڑان سی لی اور اپنی فالستہ جبلت کے خلاف کان جھکا کر گویا بغاوت کا نوٹس دے دیا اور پیچھے کو سر سے ٹکر رسید کی اور سدن خاں کا چہرہ ہموار ہوگیا۔ ناک چپک کر رُخساروں میں مل گئی، دانت حلق میں جا پڑے، راسیں ذرا ڈھیلی ہوئیں۔ اور میڈم کلوڈیا سے آگے جا گرا اور یہ وننگ پوائنٹ تھا! اور سدن خاں اُستاد تو وننگ پوائنٹ پر گھوڑا چھوڑ کر پولیس کے ہنٹر اور کسانوں کے ڈنڈے دونوں چیزوں کے خوف سے چپکی ناک دبائے لہولہان چہرہ چھپائے ایسے فرار ہوئے۔ جیسے زمین نگل گئی۔ کسانوں نے بڑے زور سے گیج کر وننگ پوائنٹ کی جانب یلغار کی۔ بچہ میر کی جے، روہیلکھنڈ نرپش کی جے"! اور ان کا بس نہ تھا کہ چاروں ٹانگوں سے اُٹھا کر بچہ کو کندھوں پر رکھ لیں۔ اور پولس کے انتظام کرنے والے کانسٹیبل روکتے ہی رہے۔ مگر وہ بچہ تک پہنچ گئے۔ اس مرتبہ ہر جیت کی طرح استاد شہامت خاں تو موجود ہی نہ تھے۔ جنھیں وہ بچوں کی طرح اُٹھا لیا کرتے تھے۔ بے اختیار ہو کر چند آزاد نوجوانوں نے بچو میاں کو اُٹھا لیا۔ مگر بچو میاں کی آنکھوں سے تو آنسو جاری تھے اور چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں اور دل دھک دھک کر رہا تھا کہ آج کسانوں کی ساری خوشی

مٹی میں مل جائے گی اور ان کی عمر بھر کی عزت کو بٹہ لگ جائے گا اور جب یہ حال کھلے گا کہ ان کا بچہ نہیں جیتا ہے تو سارا جوش ماتم ہو جائے گا اور پھر جب یہ معلوم ہوگا کہ بچہ چودھری نے بیچ دیا ہے تو وہ جھوٹے ہو جائیں گے۔ اور شاید انھیں ڈوب مرنے کو جگہ نہ رہے گی۔ اور جو کالک تین مہینے بیشتر لگنے سے بچی تھی وہ آج لگ کر رہے گی۔ اور ستم بالائے ستم بچہ نے یہ کیا کہ اپنے سائیس کے روکے نہ رکا اور شرارت دکھانے لگا۔ اور بچو میاں کے پیچھے پیچھے بھیڑ کے ساتھ چلنے لگا۔ ادھر بچہ کے آگے گرتے ہی لیڈیز کی قطار سے ایک "ڈائنگ" بڑی سی بلند ہوئی۔ اور دو بہنیں آنکھوں سے نیچے آپڑیں۔ کمشنر صاحب کی میم صاحبہ "فینٹ" کر گئیں۔ اور کئی مہمان مسیس "فینٹ" ہو کر گرتے گرتے بچیں۔ میڈیکل ایڈ مہیا ہوئی۔ دو ایک سینئر لیڈیز نے سنبھالا۔ میم صاحبہ کے حلق میں برانڈی کے قطرے ٹپکا کر بمشکل کیمپ تک پہنچایا گیا۔ اور ریس کے میدان سے ہر کلکٹر، ڈپٹی کلکٹر، تحصیلدار، سپرنٹنڈنٹ پولیس، ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ اور انسپکٹر، تھانہ دار اور سب چھوٹے اہل کار رید ہے کمشنر صاحب کے کیمپ پہنچے۔ جیسے ان کے یہاں غمی ہو گئی ہے۔ اور میم صاحب نے پہنچتے ہی کیمپ اکھیڑنے کا حکم دے دیا اور چلتے وقت کمشنر صاحب نے تو کچھ نہ کہا لیکن میم صاحب نے سب افسروں کی موجودگی میں کلکٹر صاحب بہادر سے نہایت سنگین قسم کے شکایتی انداز میں کہا کہ بڑے شرم کی بات ہے آپ کا ہی ایٹی کیٹ ہے۔ آپ نے ایک لیڈی سے جھوٹا وعدہ کیا۔ اور دھوکا دیا۔ آپ جیسے ذمہ دار افیسر اور کلچرڈ قوم کے جنٹلمین کو یہ چیز زیب نہیں دیتی۔ اور اب کلکٹر صاحب کے کیمپ پر کوتوال صاحب کی پیشی اور جواب طلبی تھی۔ کوتوال صاحب اندر طلب کر لئے گئے بچہ بلا کر باہر کھڑا کر لیا گیا۔ دفتر کے کیمپ میں آمنے سامنے کرسیوں پر غصہ میں شعلہ سے دہکتے کلکٹر صاحب اور ناگ کی طرح بل کھاتے سپرنٹنڈنٹ صاحب بیٹھے تھے۔ سپرنٹنڈنٹ آہستہ آہستہ اپنے گیٹرس پر چپکی مار رہا تھا۔ اور کلکٹر سفید مونچھ چبا رہا تھا۔ کوتوال صاحب نے اندر پہنچ کر گھٹ سے سلوٹ دیا۔ اور کلکٹر نے دانت کٹکٹا کر کہا "یو ڈولرڈ آف لے سٹی کوتوال، یو نیٹیو ہنڈگ، یو ہنگ آف لے سٹی کوتوال۔" اور میز پر گھونسہ مار کر کہا "ول تو سب کو دھوکا دیا۔ ورتھ لیس برٹ" اور جب دوسرے گھونسے کے بعد بھی منگا ہوں سے دیکھتے ہوئے دانت کٹکٹا کر اور نیچے کا ہونٹ نکال کر کلکٹر صاحب نے سانپ کی سی پھنکار مار کر ذرا سکوت کیا تو سپرنٹنڈنٹ صاحب بہادر نے ایک شیر کی سی غوں نکالی۔ اور بولے "یو ڈیمڈ سب انسپکٹر۔ ول بچہ کس کا گھوڑا ہے؟" اور کوتوال صاحب کے دونوں جڑے ہوئے ہاتھ سپرنٹنڈنٹ کی آواز پر اور بھی تھرانے لگے۔ حو۔ حو۔ حضور شیخ جی کا ———!

"ہوں ڈیمڈ تم ہم کو بولا شیک جی کا ——— پھر گدھا فک بتاؤ بچہ کیوں آگے گیا۔؟" اور اس کا جواب بچہ کے سوا کسی کے پاس نہ تھا اور کوتوال صاحب بے چارے بلی کی طرح منہ چلا کر دو مرتبہ میاؤں میاؤں سی کر کے رہ گئے۔ اور سپرنٹنڈنٹ نے میز پر بڑے زور سے گھونسا مارا اور شیر کی طرح بپھر کر گرجا "یو ڈیمڈ کوتوال کا بچہ ہم پوچھنا مانگتا ہے سؤر کا مانک بولو ڈیمڈ ——" "او۔ او۔ ای۔ ای۔ ایس۔ آن ———" اور یہ کوتوال صاحب کے نکلے ہوئے دانتوں میں سے نکلتی ہوئی آواز تھی جو سکڑے ہوئے ہونٹوں کو جمع کرنے کی ناکام کوشش میں کلام موزوں کا جامہ نہ پہن سکی۔ اور کلکٹر صاحب نے فوجی کپتان قسم کے سپرنٹنڈنٹ پولیس کا انداز بجائے زبان کے ہاتھ سے جواب طلب کرنے کا دیکھ کر اشارے سے روکا۔ اور اس کے منہ سے بات لے کر مائل بہ نرمی ہوئے۔ اور ضابطہ کی طرز میں کہا "بولو —— تم بولا کپتان صاحب سے کہ تم چودھری سے گھوڑا شیک جی کے نام سے مول لیا ——" اور کوتوال صاحب بہادر، سپرنٹنڈنٹ کے چہرے سے نگاہیں چرا کر بمشکل کلکٹر صاحب کے جواب میں بار بار تھوک نگل کر حلق سے مری مری، جی حضور نکال سکے۔ اتنے میں سپرنٹنڈنٹ پھر آگ بگولہ ہو کر پھٹ پڑا۔ "یو ڈیمڈ بلڈی!" —— اور تمہارا گھوڑا کمشنر صاحب کی میڈم کو ڈیاسے دِن کیا"!؟ —— اور کہہ کر اسکاٹ النسل فوجی سپرنٹنڈنٹ پھر تمکا۔ اور آئی۔ سی۔ ایس

کلکٹر نے پھر روکا۔ اور بولا "اچھا چپراسی شیک جی کو بلاؤ"۔۔۔

"بلڈی" ہوں ۔۔۔ ڈیمڈ شیک جی! غوں ۔۔۔ غاں ۔۔۔ غاؤں!" سپرنٹنڈنٹ پولس غرّایا ۔۔۔ اور چپراسی دوڑتا ہوا شیخ جی کے پاس پہنچا جو کوتوالی کے کیمپ میں مہمان تھے۔ اور شیخ جی پکّی گولیوں کے کھیلے کب تھے۔ اُن کو بُری سے بُری اور اچھی سے اچھی دور سے سوجھ گئی تھی۔ پھر چھوٹے بیٹے والی سردس کی ایک لاکھ اکیاون ہزار کی دوسری قسط سامنے تھی۔ جس کی داغ بیل ایک مہینہ پیشتر اس کے نھانہ داری کے سلکشن میں آتے ہی پڑ گئی تھی۔ اور اس بُرے دقت کو سوچتے ہوئے اُنھوں نے بہ نظرِ احتیاط دفتر پر بچہ کے مالک کا نام نہایت دور اندیشی کے ساتھ منشی کے پاس بیٹھ کر درج کرا دیا تھا۔ جس کی ساری تیزیاں اور سعادتیں اور ایک ایک مُبارک بھونری اس وقت کوتوال صاحب بہادر کے سر پر بلا بن کر سوار ہوگئی تھی۔ اور ایسے ہی وقت کے لئے وہ بچہ کی رسید فروخت جیب میں ڈال کر چلے تھے جو انھوں نے وننگ پوآئنٹ پر بچہ کے جست کرتے ہی بہ نظرِ احتیاط جیب میں رکھنا بھی خالی از خطرہ نہ سمجھی تھی اور فوراً نکال پھاڑ دی تھی نہایت دلیری کے ساتھ جا دھمکے۔ کلکٹر صاحب نے سوال کیا "ول شیک جی۔ بچہ تمھارا گھوڑا ۔۔۔؟"

"نہیں حضور! میرا نہیں"

اور سپرنٹنڈنٹ نے پوچھا "اچھا ڈیمڈ بچہ کس کا ۔۔۔؟ کوتوال کا گھوڑا ۔۔۔؟"

"اب یہ حضور مجھے معلوم نہیں" ۔۔۔ اور یہ کہتے ہوئے کوتوال کی جانب دیکھا۔

"ہم پوچھنا مانگتا ہے؟ گدھا کا مافک! کوتوال چودھری سے تمھارے نام گھوڑا مول لیا؟" سپرنٹنڈنٹ نے کہا۔

"نہیں حضور" شیخ جی نے نہایت استقلال کے ساتھ جواب دیا۔ اور کلکٹر نے کہا "اور یہ بات بچہ نمائش سے اب تک تمھارے اصطبل میں رہا؟"

"نہیں حضور" شیخ جی نے تڑسے کہا۔

"اچھا تو یہ بات کہنے والا جھوٹا ہے کہ بچہ شیخ جی کا گھوڑا ہے"؟ کلکٹر صاحب نے سوال کو قانونی شکل میں ڈھالا۔

"بالکل جھوٹ" شیخ جی نے کہا۔

"اور یہ اسٹیٹ مینٹ بھی دینے والا جھوٹا ہے کہ بچہ شیخ جی کے نام کوتوال نے اپنی جیب سے دام دے کر چھٹی رسید کیا ہے" سپرنٹنڈنٹ نے پوچھا۔

"حضور بالکل جھوٹا" شیخ جی نے نہایت اطمینان کے ساتھ کہا۔ اور سپرنٹنڈنٹ پولس نے میز پر گھونسہ مار کر گرج کر پوچھا۔ "پھر ڈیمڈ کس کا گھوڑا ہم پوچھنا مانگتا ہے"۔

مگر شیخ جی ذرا نہ ڈرے اور آہستہ سے بولے "حضور یہ میں کیا جانوں؟" اور رُک کر آہستہ سے کہا۔

"حضور دفتر سے ریس کا رجسٹر منگا کر دیکھ لیں" اور پھر پُر اطمینان تیور بنا کر سلسلۂ کلام جاری رکھا۔

"ہر مالک اپنے اپنے نام سے گھوڑا دوڑاتا ہے اور حضور اپنے ہاتھ سے انعام ہی جو دیں گے مالک کو۔ وہ کوئی ایسی بات تو نہیں جو چھپی رہے"۔

اور کلکٹر نے آواز نکالی "منشی گھوڑ دوڑ رجسٹر کے ساتھ لاؤ"۔

اور ذرا دیر میں منشی مع رجسٹر کے آ گیا۔ کلکٹر نے کہا "آج کی ریس میں بچہ کس کے نام سے شریک ہوا ہے"

"حضور چودھری ناظم علی خاں، اولیس گڈھ" اور یہ کہہ کر رجسٹر کھولا۔ کلکٹر صاحب نے بچہ اور اس کے مالک کا نام پڑھا اور خانۂ کیفیت میں ریفری سول جج کے دستخط اور ریمارک بھی پڑھا۔ جنھوں نے فوراً دوڑ کے بعد بچہ کی جیت کا اعلان کیا تھا اور اور پھر جیت کی تفاصیل اور مالک کا نام لکھا تھا۔ اور کلکٹر نے کہا "چودھری کو بلاؤ"

اور چپراسی دوڑا ہوا چودھری کے کیمپ پہنچا پہلے سے مجملاً کچھ حالات بھی معلوم ہو گئے تھے۔ بیچارہ خلفشار میں تھا۔ طلبی سنتے ہی بوڑھے چودھری کے طوطے اڑ گئے۔ سمجھ گیا تھا کہ جب تو عزت بچ گئی تھی اب نہیں بچتی۔ دونوں بڑے بیٹوں سے مشورہ کیا اور یہی رائے قائم ہوئی کہ چپراسی کو روپیہ دو روپیہ دیکر ٹال دیا جائے اور کہلوا دیا جائے کہ یکدم طبیعت خراب ہو گئی اور گھر چلے گئے اور گھوڑی پر سوار ہو کر فوراً اولیس گڈھ بھاگ جائے اور میلہ بھر بیماری کا عذر رکھے اور جب تک رہ سکے روپوش رہے۔ کچھ سن گن بچو میاں بھی پا گئے تھے۔ یوں تو تمام میلہ ان پر مبارک باد کی بوچھاریں کر رہا تھا مگر جب دفتر کے منشی نے مبارک باد دی تو ان کا ماتھا ٹھنکا اور ذرا آگے بڑھ کر ریس کے ریفری سول جج نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ مبارک باد دی اور اسپورٹس مین لائک انداز میں بڑھ کر ہاتھ ملایا تو بچو میاں گومگو میں پڑ گئے اور یہ خیال کیا کہ شاید افسران کی سازش سے بچہ کی ہار کو رنگین تر بنانے کے لئے ان کے باپ نے گھوڑا اپنے نام سے دوڑایا ہوگا اور رجسٹر ڈ میں اپنا نام لکھا دیا ہوگا "تاکہ بچہ میڈم کلوڈیا کے مقابلہ پر انھیں کا گھوڑا ہو کر اور انھیں کے سر ہو کر ہارے۔

ادھر کسانوں میں کچھ بھلی اور کچھ آج کی خبر مسخ ہو کر یہ اڑ گئی کہ کوتوال صاحب بچہ زبردستی چھینے لیتے ہیں۔ اور بے چینی پھیل گئی۔ جتنے منہ اتنی باتیں سنتے۔ بچو میاں اپنے کیمپ پہنچے۔ بھائی سراسیمہ۔ باپ بدحواس۔ نوکر چاکر پریشان دیکھے اور گھوڑی کسی ہوئی تیار، اور چودھری فرار ہونے کے لئے پا بر کاب، اور چودھری نے چھوٹے بیٹے کو دیکھتے ہی بسورتے ہوئے فریاد کی: "بیٹا! وہ بچہ جیت گیا اور سنا ہے کہ کسی دشمن نے دوڑ کے رجسٹر میں منشی سے سازش کر کے ہمارا نام لکھا دیا ہے مالک کے خانہ میں"

بچو میاں نے نہایت ہی شان استغنا سے کہا "تو اس میں کسی نے جھوٹ بھی کیا لکھایا گیا، بچہ ہم نے کسی سالے کے باپ کے ہاتھ بیچا ہے"؟

"ارے بیٹا ایک آفت میں پڑ کر تو یوں بچے تھے واں نمائش میں، اور آج یہ اور آپڑی سر پر یا اللہ! وہی ہوا جس سے ڈرتے تھے" چودھری نے روتی ہوئی آواز میں کہا اور آسمان کی جانب ہاتھ اٹھا کر اپنے گناہوں کی معافی مانگی اور پھر گڑگڑا کر شبہ رقت آواز میں کہا "وہ بھری نمائش تھی اور یہ بھرا میلہ! میرے معبود آبرو تیرے ہی ہاتھ ہے اس عاصی بندۂ گنہگار کی آج"

اور اس کی نگاہ میں بچہ سانپ کی طرح گھوم رہا تھا۔ اور اس کی ماں کی ایک ایک نحس بھونری دماغ میں ناگن کی طرح لہرا رہی تھی اور وہ پھر بڑبڑایا "میں نے اپنی ماں کی نصیحت نہ مانی اور اس سپولیئے ناگن کے جنے کو کٹھیلے کے گھر سے منگا لیا اور اور یہ ماں کی سب نحوستیں ساتھ لایا....." اور بچو میاں نے بات کاٹ کر کہا "ابا میاں آپ کیوں ڈرتے ہیں۔ گھوڑا تو ریس کے رجسٹر میں میرے نام پر درج ہے اور ابھی سول جج صاحب نے جو ریفری ہیں مجھے بتایا۔ اور منشی سے بھی تصدیق ہوئی"

"اچھا بیٹا تمھارے نام پر درج کرا دیا کسی دشمن نے! غضب خدا کا!"

"غضب کیوں، فضل نہیں خدا کا، بچہ جیت گیا اور میں جاتا ہوں" بچو میاں نے نہایت ہی بانکپن سے کہا۔

"نہیں بیٹا تم نہ جاؤ، گھوڑا بدخواہوں نے تمھارے نام پر لکھوا دیا اور جیت گیا۔ تم بھی میرے ساتھ بھاگ چلو!"

"کیوں ؟ ابا میاں بھاگنے کا کیا سوال آپ کے یا میرے، ابھی تو چھاتی پہ مونگ دَل کے انعام لینا ہے سالوں کے ہاتھ سے"۔

"دیکھو بیٹا، تمھیں گرفتار کرلیں گے، چپراسی کہہ رہا تھا صاحب لوگ بہت گرم ہیں۔ اور عجب نہیں کہ بڑے صاحب نے ڈپٹی صاحب حاکم پرگنہ کو تمھاری گرفتاری کی ہدایت دے دی ہو" چودھری نے ڈر کے مارے گھگھیا کر کہا اور بیٹے کا بازو پکڑ لیا۔

"جی ہاں گرفتار کرلیں گے کس مسالے پر! یہ بھی کوئی شہر ہے!" بچو میاں نے ٹیڑھی گردن کر کے کہا۔

چھمن میاں جو چپ کھڑے باپ بیٹے کا مکالمہ سُن رہے تھے بولے "ذرا عاقبت اندیشی اور مصلحت سے کام لو بچو میاں حاکم کی اگاڑی، گھوڑے کی پچھاڑی بچائے رہنا چاہیے"۔

"بس آکا بھائی جانے بھی دیجیے، یہ شہر کی نمائش اور وہ مکان نہیں ہے جہاں چوہے کی طرح پھانس لیا تھا، یہاں تو حاکم کی اگاڑی پر بھی بھڑوں گا اور گھوڑے کی پچھاڑی پر بھی"۔

"اور اگر گرفتار کر لیا تو ــــ؟ مجن میاں نے کہا۔

"دیکھیے بھائی جان! آپ لوگ اس حاکم طبقہ کو ایک پہلو سے پہچانتے ہیں اور میں اُن کے پوستین کے نیچے بھی ان کو دیکھ چکا ہوں اور خاص طور پر مجسٹریٹ قسم کے لوگ، بھیا سمجھ لو بس یہ، یہ مارتے کے آگے آگے اور بھاگتے کے پیچھے پیچھے ہوتے ہیں، آج آپ دیکھیں گے کہ جو آنکھ بھی ملا جائیں مجھ سے، گرفتار کرنا تو درکنار"۔

"دیکھیے ابا میاں! پھر وہی باتیں حماقت کی" دونوں بھائیوں نے یک زبان ہو کر کہا "ان سے یہ پوچھیے کہ اگر گرفتار کر لیا تو؟"

بچو میاں نے مسکرا کر کہا "گرفتار کرنا تو درکنار آنکھ سے آنکھ ملا کر بات بھی نہیں کرسکتے"۔

"نہیں میاں میں تم سے پوچھتا ہوں کہ اگر گرفتار کر لیا تو کیا کرو گے؟" چودھری نے کہا۔

"ابا میاں، خیر گرفتار کرنا تو محال ہے اگر دھمکی بھی دی تو میلہ اُلٹ دوں گا، روہیلکھنڈ درہم برہم کردوں گا۔ آج میں اپنوں میں ہوں، شہر کی نمائش نہیں ہے"۔

یہ کاتکی اشنان میلہ ہے" اور کہتے ہوئے تمام میلہ کی فضا میں چاروں طرف ہاتھ بلند کر کے اشارہ کیا۔

اور بوڑھا باپ نوجوان بیٹے کے اکھڑپن اور ناعاقبت اندیشی پر بگڑ گیا "جی آپ تو زمین اُلٹ دیں گے! بڑے ہفت ہزاری خان خاناں" اور دونوں بڑے بیٹوں کو مخاطب کر کے کہا "کچھ نہیں بیٹا یہ خود سر نالائق بھرے میلہ میں ہماری کرکری کرائے جا رہا ہے کہ چودھری کا لائق بیٹا ہتھکڑیاں پہن کر حوالات گیا، افسوس نہ معلوم کیا کیا بڑھاپے میں دیکھنا لکھا ہے"۔

اور بچو میاں کھلنڈرے انداز میں ہنس دیے اور آہستہ سے کہا کہ "میں جاتا ہوں کچھ نہیں ہوگا آپ اطمینان سے بیٹھیے" اور چپراسی کے ساتھ چل پڑا۔ اور چودھری دعا و ردِ بلا بڑھتا اور پڑھ پڑھ کر دور سے دَم کرتا رہ گیا اور چند ہی قدم میں بچو میاں نے چپراسی سے تمام روئداد معلوم کرلی اور جس وقت تک کلکٹر صاحب کے کیمپ تک پہنچے ہزاروں کسانوں کا مجمع ساتھ ہوگیا۔ کیمپ کے سامنے میدان میں پہلے بچہ ہی سے آنکھیں چار ہوئیں اور بچے نے شکوہ میں نہا کر طنز کا ایک لمبا تیر پھینکا۔ جیسے حضرت سلیمان کی طرح بچو میاں لفظ بلفظ سمجھ گئے کہ کہہ رہا ہے کہ واہ میاں بچو میاں واہ! تم نے تو خوب نبھائی بچپن کی! قصائی کے کھونٹے باندھا اور بیچ میدان آج شکنجہ میں کسوا کر ساری عمر کی کری کرائی خاک ہی میں ملا دی تھی۔ اور بچو میاں نگاہیں جھکائے اندر کو لپک گئے اور

گھستے وقت پھر ہنہنایا "میاں جاتے کہاں ہو؟ ذرا جواب تو دیتے جاؤ" مگر وہ اندر چلے گئے۔ بغیر آنکھیں چار کئے ہوئے اور بغیر مڑ کر دیکھے ہوئے۔ اور اندر پہلی نگاہ ڈالتے ہی سمجھ گئے۔ جزوی تفاصیل چپراسی سے معلوم ہو گئی تھیں۔ ایک ذرا ٹھٹکے اور پھر بڑی آزادی کے ساتھ ایک کرسی گھسیٹ کر بغیر ہی کسی کے کہے ہوئے بیٹھ گئے۔ کلکٹر صاحب نے ذرا جھینپی جھینپی نظروں سے بچو میاں کا استقبال کیا اور بڑے شیریں لہجہ میں سوال کیا "چودھری ناظم علی خاں صاحب، آج کی ریس کا جیتا ہوا گھوڑا بچہ نامی آپ ہی کا ہے نا"؟

"جی ہاں" بچو میاں نے کہا، اور آواز پہچان کر باہر سے بچہ نے خوشی کے ساتھ گویا تصدیق کی اور اثبات میں ہنہنایا، ہاں، ہاں، ہاں!! آں ہاں، ایں۔ ہوں، ہوں، ہوں؟ پھر کیوں شہر میں قید کر دیا تھا اپنے بچہ کو!"؟ آواز شکوہ میں بدل گئی اور لہجہ سوالیہ ہو گیا۔

اور سپرنٹنڈنٹ نے سوال کیا" اور یہ بات غلط ہے کہ آپ نے یہ گھوڑا شیخ مشرف الدین کے نام فروخت کر دیا تھا"؟

"جی بالکل غلط" بچو میاں نے کہا" اور بچہ آواز سُن کر پھر پیار بھری ہنہناہٹ میں بولا "ہوں نا نا، ہوں نا نا، ہوں، ہیں نا نا، ناہیں ناہیں، اور تصدیق کر کے گویا پھر شکوہ کرنے لگا" پھر مفت میں واں اندھیرے شہر میں کیوں بند ھوا کر اگاڑی پچھاڑی لگوائی تھی۔؟ ایں، ہیں، ہیں، ہاں"!!

اور اب کی مرتبہ فوجی کپتان اسکاٹ النسل سپرنٹنڈنٹ پولیس باوجود کلکٹر صاحب کے اشارے کے بھی نہ رُکا۔ اور امونیشن بوٹ کی ٹھوکروں سے کوتوال پر پِل پڑا۔ ساتھ ہی ساتھ ٹھوکروں کی گردِش سے خود ہی جھاڑتا تھا اور قانونی دھمکیوں کے ساتھ ہندوستانی اور انگریزی گالیوں کے نئے امتزاج سے ایک اینگلو انڈین گالی کی ترکیب مرتب کرتا رہا۔ اور سپرنٹنڈنٹ کے ہاتھ اور پاؤں کی تیزی کے مطابق ہر ضرب اسی سرعت سے کوتوال صاحب اٹنشن ہو ہو کر قاعدہ میں پاؤں کو لہوں ادھر کمر پر لیتے رہے۔ اور کلکٹر صاحب کے پیہم اشاروں پر سپرنٹنڈنٹ صاحب ذرا دھیمے ہوئے اور قانونی الفاظ زبان پر لائے "ڈیمڈ" یہ دفعہ ۱۰ کی کارروائی! ڈیمڈ لیئر حاضر کیا جاتا ہے۔ ڈیمڈ کو سسپینڈ کیا جائے اور حکم دے کر ایک فدا سانس لی۔ اور کلکٹر نے شیریں انداز میں جیسے یہاں کچھ ہوا ہی نہیں ہے۔ اور جو کچھ ہوا وہ ان کی ڈیپارٹمنٹل کارروائی تھی۔ بچو میاں سے مخاطب ہو کر انگریزی میں کہا "چودھری ناظم علی صاحب آپ جا سکتے ہیں اور گھوڑا تو آپ کا شاید باہر کیمپ کے سامنے کھڑا ہے لے جائیے"۔

بچو میاں نے سلام کو ہاتھ اُٹھایا اور جوں ہی گھومے مقبوط کوتوال صاحب کا سامنا ہوا جو بدستور اٹنشن کھڑے ضابطہ کا اٹھیوں بنے ہوئے تھے۔ انھیں بچو میاں نے نہایت ادب کے ساتھ جھک کر آداب کیا۔ اور باہر نکل آئے۔ دروازے کے سامنے غازیانہ انداز میں بچہ ترچھا ترچھا نتھنے پھُلائے کف در دہاں کھڑا تھا اپنی اس تاریخی ذقند کے احساس میں بھرپور، جو اس نے کلکٹر صاحب۔ کمشنر صاحب، لاٹ صاحب، ہز ہائی نس اور شاہ جارج کے سر پہ سے لگا کر یہ تاریخی بازی جیتی تھی۔ استاد شہامت خاں کو جن کی کمر کا درد اس ذقند کے ساتھ رفع ہو گیا تھا چودھری نے بچو میاں کے پیچھے پیچھے بھیج دیا تھا اور استاد بچہ کی گردن اور سینے پر مُبارک دیومن اور سعد کٹھ من بھونریوں پہ ہاتھ پھیر رہے تھے اور اس کی باچھوں سے کف کے ساتھ ساتھ رِل رِل کر بہتا ہوا خون اپنی پگڑی کے طرّے سے پونچھ پونچھ کر آہستہ آہستہ شاباش دے دے کر بچہ کو منا رہے تھے۔ کچھ بوڑھے کسان اپنی پگڑیوں اور چادروں سے پسینہ خشک کر رہے تھے اور نوجوان محبت کے ساتھ ہاتھ پھیر رہے تھے اور بچو میاں کو دیکھ کر بچہ پھر شکوہ کی مخصوص آواز میں ہنہنایا۔ بچو میاں نے لپک کر اس کی گردن میں ہاتھ حمائل کر دیئے "ہوں اونہوں نانانا، ہیں ناہیں" بچہ نے ناز کے انداز میں جیسے مُنہ پھیرنا چاہا۔ مگر بچو میاں مُنہ پکڑ کر اُس کے نرم نرم گرم گرم تر و تازہ ہونٹوں میں اپنے ہونٹ پیوست

کر دیئے اور محبت کے جذبات میں تھرتھرائی، کانپتی اشرف المخلوق اور اشرف الحیوان سانسیں مل گئیں شکوے مٹ گئے۔ بچو میاں کی نرگسی آنکھوں سے تو دو عفو طلب آنسو ہی ڈھلکے اور بچہ کی ہرن کی سی انکھڑیوں سے دو دھاریں بہ کر ہونٹوں پر جمع ہو گئیں۔" لو بچہ اب من بھی جاؤ نا!" بچو میاں نے کہا اور بچہ من گئے۔" ہوں، ہوں، ہوں، آں ہاں! پچ پچ پچا پچ، چٹاخ پٹاخ، چپا چپ" بوسوں کا تبادلہ ہونے لگا۔ دھم دھم بچہ نے سیدھی ٹاپ زمین پر مار مار کر، اور بار بار اثبات میں سر ہلا کر گویا بچو میاں کو اور قریب بلایا اور بچو میاں ذرا کھسک کر سینے سے لپٹ گئے۔ گردن سے گردن ملا دی اور رخسار پر رخسار رکھ دیا اور جیسے ناز کے انداز میں پیار کے ساتھ اپنے ننھے بچے سے بات کرتی ہے بولے۔" ہوں بچہ خفا ہو گئے بیٹا! اوں، آں، واں شہر میں پھنس کر، لو اب چلو گھر چلو۔ گھی گڑ کا ملیدہ کھاؤ، بیسن کی چپڑی کھاؤ۔ ہوں ہوں، آں، پچ پچ!" گھر گھر گھومو، اپنا ٹکڑا کھاؤ کھیت کھیت بھاگو، موٹھ کی پھلیاں پک گئیں، گترتے پھرو۔" ہوں، ہوں، ہاں ہاں، پچ پچ۔" کولہو کو ہو میٹھا رس پیو اور اپنی شیا ما، ماتا کا گنگنا گنگنا دودھ پیو۔" چپ چپ چپ" بچہ نے ہونٹ چاٹے۔" سب تمھیں یاد کرتے ہیں، خوب کودو۔ خوب پھاندو، سب کو تماشہ دکھاؤ" اور بچہ کے تیور شہد ہی شہد ہو گئے، اور آنکھوں میں، جیسے شیاما ماتا کے دودھ کے دھارے پھوٹ پڑے۔" لو اب تو من گئے ہمارے بچہ بیرا۔" اور بچو میاں نے گردن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔" اونہہ دیکھو تو نمک حرام ستنا بدمعاش کھینچتے کھینچتے، ہمارے بچہ کی گردن دوہری کر دی۔" اور اپنے ریشمی رومال سے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔" اور لگام کیسی کٹیلی چڑھائی تھی کہ میرے بچہ کی باچھیں کٹ گئیں!" اور ستنا کا نام کان میں پڑتے ہی بچہ کے تیوروں میں خشونت پیدا ہو گئی آئینہ سی پیشانی پر بل پڑ گئے، نرم نرم نتھنے سخت ہو کر پھول گئے، نازک کنوتیاں بدلیں اور اظہار ناراضگی میں کان گردن سے آچپکے۔" ٹھنا نا نا نا۔ اور ستنا نمک حرام کے نام پر آنکھوں میں خون سا اتر آیا۔ غیظ میں بھر کر اگلی ٹاپ سے زمین کوٹ ڈالی گویا ستنا نمک حرام کا بھرتہ بنوڈالا اور بچو میاں نے تیور پہچان کر بات کا رخ بدلا۔" لو شیا اب گھر چلو۔" اور اس نے محبت بھری آواز میں جواب دیا۔" ہاں ہاں ہوم ہوم ہوم ہوم۔" اور بچو میاں نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی "ہاں بیٹا بس گھر چلو، ہوں، اوں، آں، ہاں۔ آج گھر گھر تمھارے گیت گائے جائیں گے، چلو اپنے گیت سنو۔" اور جیسے ہر چیز یاد کر کے بچہ نے حلق کے اندر سے آواز نکالی۔" ہاں ہاں ہوم ہوم ہوم" اور بچہ کا دل پگھل کر موم ہو گیا اور آنکھوں سے جیسے شیاما ماتا کے دودھ کے دھارے پھوٹ پڑے اور بچو میاں نے اپنا رومال اس کے رخساروں پر پھیرتے ہوئے کہا۔" اب غصہ تھوک ڈالو۔" اور بچہ نے مخصوص آواز نکالی۔" پھُر پھُر پھُر" گویا غصہ تھوک ڈالا۔" لو چلیں اب۔" بچو میاں نے زیر لب کہا! اور اس نے پیار اور سپردگی کے انداز میں ذرا جھک کر سواری کے لئے بیٹھ پیش کی اور" ہوم ہوم ہوم، گھر گھر گھر" کی مخصوص پیار بھری آواز حلق سے نکالی، گویا گھر چلنے کو کہا۔ بچو میاں اچھل کر سوار ہو گئے۔ سب کسانوں نے جوش کے ساتھ نعرہ مارا۔" بچہ بیر بڑھے رہو" اور بچہ نے ایک خوبصورت ساجل کھا کر ناز کے انداز میں ایک رقص جیسی حسین پھرکی سی لی اور اولیس گڈھ کی جانب رخ کر دیا۔ کوسوں میں پھیلا ہوا میلہ لاکھوں جوشیلی آوازوں سے اس سرے سے اس سرے تک زیر و زبر ہو گیا۔ دُور دُور تک میدان، جنگل اور دریا جیسے سب کچھ ہل گیا۔ اور تیز گام بچہ کی ٹاپوں کی آواز" بچہ بیر جیتے رہو، بچہ بیر ہمارا، رو بلکھنڈ نریش کی جے، کشمیر بیر ہمارا" کی گونج میں گم ہو گئی۔

"چڑھتا سورج" ابوالفضل صدیقی صاحب کا وہ افسانہ ہے جس کو پی۔ ای۔ این (پاکستان) کے منعقد کردہ انعامی مقابلے میں اُردو کا بہترین افسانہ قرار دیا گیا تھا اور موصوف کو مبلغ ایک ہزار کا انعام ملا تھا۔ فیصلہ کرنے والوں میں بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب مرحوم، پروفیسر مرزا احمد سعید صاحب اور مولانا صلاح الدین احمد صاحب تھے۔

نادرات

بیجاپور کے دو گمنام شاعر

فاضل خاں ابن افضل خاں بیجاپوری، المتخلص بہ فاضل کی دکنی غزلیں :

سخاوت مرزا

فاضل خاں کی ایک دکنی غزل ہم کو بابائے اردو مرحوم کے کتبخانہ کے ایک قلمی نسخہ کلیات سلطان علی عادل شاہ سے دستیاب ہوئی ہے جس پر ہم یہاں کچھ روشنی ڈالتے ہیں۔

فاضل (فاضل خاں) کے حالات پردہ تاریکی میں ہیں۔ کیونکہ اس نے اپنی ولدیت افضل خاں لکھی ہے، اور زبان دکھنی ہے۔ اس لحاظ سے فاضل ایک دکنی شاعر تھا اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ افضل خاں بیجاپوری مشہور و معروف عادل شاہی وزیر اور سپہ سالار کا لڑکا تھا، جس نے سیوا جی مرہٹہ کے مقابلے میں سخت یلغار کی تھی، اور سیوا جی کو سوائے اس کے کہ کوئی مکر گانٹھے چارہ نہ تھا یعنی صلح کے لئے نہتا ملنے کی شرط پیش کی مگر سیوا جی خود مسلح تھا۔ چنانچہ اس نے دھوکے سے افضل خاں کے سینے میں خنجر بھونک دیا۔ جو تاریخ میں ایک بدنما داغ ہے۔ یہ واقعہ سنہ ۱۰۶۹ھ کا ہے۔ غرض افضل خاں شہید کی نعش بیجاپور نہ لائی جاسکی وہیں پرتاب گڈھ میں دفن کردی گئی جہاں سیوا جی نے اس کو قتل کیا تھا۔ افضل خاں کا قبل از مرگ بنایا ہوا شاندار مقبرہ موجود ہے مگر قبر کی جگہ خالی ہے۔ البتہ اس کی ازواج وہاں مدفون ہیں۔ غرض افضل خاں کے بنائے ہوئے محل کے آثار اور مسجد بطور یادگار موجود ہے۔ افضل خاں کی بہت سی عورتیں تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ بعض نے کنوئیں میں ڈوب کر خودکشی کرلی اور بقول مسٹر ٹیلر میڈو، بوقت مقابلہ سیوا جی وہاں موجود تھیں۔ ان کو بیجاپور واپس کردیا گیا تھا مگر سیوا جی کے افسر نے ان کو راستہ ہی میں قتل کردیا[1] افضل خاں کی اولاد ضرور ہوگی مگر ان کا پتہ نہیں چلا۔ فاضل نے خود کو افضل خاں کا فرزند ہونا ظاہر کیا ہے۔

افضل خاں — سلطان محمد عادل شاہ (۱۰۳۷/۱۰۶۷ھ) اور سلطان علی عادل شاہ ۱۰۶۷/۱۰۸۳ھ کا معتمد علیہ وزیر اور سپہ سالار رہ چکا ہے۔ چنانچہ بہ زمانۂ سلطان علی عادل شاہ ثانی ۱۰۶۹/۱۰۷۰ ہجری شہید کردیا گیا۔ دوسرے ایک اور افضل خاں المعروف حاجی اسحٰق حقانی بھی گزرے ہیں جو عادل شاہی ذی مرتبت عہدیدار تھے جن کا ذکر فرامین عادل شاہیہ میں ہے۔ (فرامین عادل شاہی، مولفہ بشیر احمد دہلوی، مطبوعہ) غرض ان حالات کے مدنظر فاضل خاں فاضل علی عادل شاہ ثانی کے زمانہ کا شاعر معلوم ہوتا ہے۔ اور یہ تو اظہر من الشمس ہے کہ سلطان مذکور کے زمانے میں بقول مؤلف تاریخ بساتین السلاطین شاعری کا گھر گھر چرچا تھا اور وہ جگت استاد مشہور تھا۔ اس لئے بلحاظ زبان اور طرز ادا فاضل خاں، فاضل اسی زمانے کا شاعر ہے اور کچھ تعجب نہیں کہ اس کا تعلق عادل شاہی

[1] گزٹیر بمبئی۔ جلد بیجاپور۔ مطبوعہ (انگریزی)

دربار سے رہا ہو۔ افضل خاں کی کوئی معمولی شخصیت نہیں تھی۔ نیز چونکہ بعض گمنام شاعروں کی دکنی غزلیں مخطوطۂ دیوان علی عادل شاہ کے ساتھ شامل ہیں، اس لئے بھی قرینِ قیاس یہ ہے کہ فاضل دربارِ عادل شاہی کا ایک دکنی بیجاپوری شاعر ہے اور اس نے محمد عادل شاہ اور علی عادل شاہ ثانی کا زمانہ دیکھا ہے۔ غرض دیوان علی عادل شاہ کے اوراق میں فاضل کی بھی دو غزلیں درج ہیں جو ہدیۂ قارئین کی جاتی ہیں۔ متاخرین میں جرأت لکھنوی اور داغ کا رنگ ہے اور قدما میں ظہور ابن ظہوری بیجاپوری کا یہی طرز ہے۔

عنوان :۔ "غزل افضل خاں فاضل"! ؎

پیاری تم آؤ سیجہ میں، ہٹ تٹ نکو کرو! — مکہ پھول آدھر میں آپنے ہٹ ہٹ نکو کرو
غصا اپس کاسٹ دے، کرو مہر مجہ اوپر — جم عشق کے محل منے کھٹ پٹ نکو کرو
راز و نیاز کے، رکھو دل میں چھپا سجن — اظہار جگ میں، حبیبتے وٹ وٹ نکو کرو
گلزارِ گال میں رہے زلفاں بھونگ مست — کس دل کے کبوتری کوں دولٹ پٹ نکو کرو
تجہ قد کے نے شکر اوپر جاں تے ہوں (میں) فدا — دو تن کی بات سن تمہیں کھٹ کھٹ نکو کرو
بے صبر نہ برہ کے اگن میں جلا جلا — اسپند کے نمن مجھے چٹ پٹ نکو کرو
فاضل خوشی میں وصل میں تمنا نہیں خبر — لٹ پٹ کے وقت باسکی جھٹ پٹ نکو کرو

لٹ پٹ، کھٹ پٹ، چٹ پٹ، جھٹ پٹ۔ وغیرہ وہی الفاظ اور محاورے ہیں جو اہل زبان آج بھی استعمال کرتے ہیں۔
غزل ۲ عنوان : "غزل فاضل خاں ابن افضل خاں"۔ اس میں گویا شاعر نے اپنی ولدیت بھی لکھ دی ہے :

اچپل چنچل کوں بولیا بالے یو ہٹ تو سٹ دے
غصے سوں ناز تھے مجہ چمٹی کری وجٹ دے
ولیے میں ہات پکڑیا، انکڑی اپس کے جاگے
لایا گلے سوں، تو بی چولے کے بند نت دے
کہیا جوانی آخر بڈپن تو ٹے گی ——!
یو چھے اگر منجے تو چوما پکڑ توں مٹ دے
یوں بات کان دھر سن محظوظ ہو وو دل سوں
لیتی بلا خوشی تے انکھیاں بھویاں ہیں لٹ دے
ایسا سبب کہڑیا جب تب پڑ پلنگ لیٹی
لٹ پٹ ہوا گیا تب لولو کا ہار لٹ دے

عہ سج ۔ ۱ پھول جیسے ہونٹوں سے ۔ ۲ بڑبڑانا ۔ ۳ کالے ناگ ۔ ۴ بیقرار کرنا ۔ تڑپانا ۔ ۵ سوگن ۔
۱ اچپل = شوخ وطناز ۔ ۲ چمٹی کری = چٹکی لینا ۔ ۳ جٹ = جھٹ سے ۔ ۴ انکڑی = اکڑ گئی ۔ ۵ گلے لایا = گلے سے لگایا ۔
۶ چولے = چولی ۔ ۷ بڈپن = بڑھاپا ۔ ۸ چھے = چاہے ۔ ۹ چوما = بوسہ ۔ ۱۰ مٹ = میٹھا ۔ ۱۱ کہا کہ تو بھی تو آخر بوڑھی ہو جائیگی کبتک جوان رہے گی ۔ ۱۲ بھویاں = بھوؤں سے اپنی بالوں کی لٹ کو ہٹا کر چٹ بلائیں لے لیں ۔ ۱۳ سب = غالباً سبب ۔ یا سبھو (؟) ۱۴ لولو کا ہار = موتیوں کا ہار

دل لال[۱۵] جب ہو میرا لالچہ ویسپا ہو بیٹھا
اتنے میں ہو تبسم اپیچ بولی پٹ[۱۶] دے
فاضل[۱۷] سخن تو میرا پل گوں جا تو بل بل
تو رشتہ ہر سینے مجہ گھٹ گانٹ گھٹ دے

۲۔ شعوری دکنی بیجاپوری :

اس شاعر کے حالات بھی تاریکی میں ہیں۔ اب تک کسی تذکرے میں اس کا ذکر میری نظر سے نہیں گزرا۔ بلحاظ اسلوب بیان اور زبان دکنی شاعر ہے۔ چونکہ اس کی ایک غزل دیوان شاہی سلطان علی عادل شاہ مخطوطہ انجمن ترقی اردو پاکستان سے مجھے دستیاب ہوئی ہے اس لحاظ سے قراین یہ ہیں کہ شعوری، بیجاپوری شاعر معلوم ہوتا ہے اور فاضل کا معاصر اور اس نے غالباً سلطان موصوف کا زمانہ دیکھا ہے۔ چنانچہ جیسا کہ سطور بالا میں ذکر کیا گیا ہے کہ علی عادل شاہ جگت استاد مشہور تھا۔ اور اس کے زمانے میں گھر گھر شاعری کا چرچا تھا۔ اس کی غزل کی تین بیت دستیاب ہوئی ہیں جو ہدیۂ قارئین کی جاتی ہیں۔ کلام میں درد و سوز ہے۔ اور علی عادل شاہ المتخلص بہ شاہی کے قصیدہ چار در چار کا طرز اڑایا ہے:

شاہی ؎
دیکھو اچنبا لگیا ہے   یوبن نوے گلاں سوں بھریا ہے سارا
سرد صنوبر سمن کے بیلاں   پھلے ہیں پھولاں اچھے مکارا

شعوری بہ طرز شاہی ؎

جداں[۱] تھے سلگی اگن برہ کی تدھاں[۲] تھے دل جل ہوا انگارا
نین نرالی[۳] ہوتے ہیں، رو رو، سنیٹر رھیا ہے جیا ہمارا
اُتھے وہ کوئی دن جو مل رہیں گے تو رس[۴] آتی تھی بار کیسری
اتال کیوں جھل[۵] نہ آتے تجہ میں، برہ جو ساتی ہوا ہمارا
سنو شعوری یو ڈکھ ہمارا، کرم سوں کرتا نظر ہمن پر
رھیا نہیں حال ہم منے کچھ، یوں دل درد سوں گلیا[۶] ہے سارا

---

[۱۵] باغ باغ ہونا

[۱۶] پٹ دے، مٹ دے = پیار، [۱۷] اے فاضل تو میری شیریں سخنی پر تو بل بل جا، تو اس محبت کے رشتہ میں مضبوط گانٹھ لگا دے۔

[۱] جداں = جب [۲] تدھاں = تب [۳] نرالی = عجیب و غریب یا نیرالی یعنی: پانی سے نرالی = یعنی پانی پانی یعنی دریا ہو گئے ہیں۔ [۴] یعنی جسم میں (راحت) - تازگی پیدا ہو جاتی تھی۔ [۵] جھل = جُھل؟ یا سوزش جلن۔ اثر

[۶] گلیا = گل گیا ہے۔ نزار و نزار۔

غزل

حیرت شملوی

کیوں ہوں نہ مغفرت کا طلبگار بھی بہت
بیمار بھی بہت ہوں گنہگار بھی بہت

سنگین ہے سزا تو کسی سے کہیں بھی کیا
یہ دیکھ کر کہ ہم ہیں خطا کار بھی بہت

اچھا ہوا کہ آپ الگ ہم سے ہوگئے
الفت کی ورنہ راہ تھی دشوار بھی بہت

ہم پر غرورِ عشق کی تہمت بجا مگر
ہے بے نیاز حسن کی سرکار بھی بہت

اب خواب ہی سہی مگر اک دور وہ بھی تھا
جب تھا کسی کا سایۂ دیوار بھی بہت

ہے یہ بھی واقعہ کہ صداقت کے نام پر
باندھے گئے ہیں جھوٹ کے طومار بھی بہت

کچھ اہلِ قافلہ ہی نہیں مست و بے خبر
بھٹکے ہوئے ہیں قافلہ سالار بھی بہت

یہ تلخیٔ کلام اسی کا تو ہے جواب
ہم ان کی بات کے تھے روادار بھی بہت

ہم زندگی سے برسرِ پیکار ہی نہیں
آلامِ زندگی سے ہیں بیزار بھی بہت

راحت کا کیا سوال کہ اس جانِ زار پر
ہے آج کل تو یورشِ افکار بھی بہت

حیرت نیاز مند تو ہے آپ کا ضرور
لیکن نہ بھولئے کہ ہے خود دار بھی بہت

وادیٔ سندھ کی زبان پر یونانی اثرات

عین الحق فریدکوٹی

" پنجاب ایک ایسا صوبہ ہے جہاں کہ وادیٔ سندھ کے قدیم باشندوں اور آریائی قبائل نیز یونانی و عرب، تاتاری و افغان اقوام کی انفرادی خصوصیات اور ان کے باہمی تعلقات کا مطالعہ بآسانی کیا جاسکتا ہے ۔ ان اقوام نے اپنے پیچھے ایک ایسا ملا جلا ورثہ چھوڑا ہے جس میں ہر ایک عنصر کی خصوصی روایات اور طرز معاشرت اسی طرح سے محفوظ ہیں جیسے کہ ایک عجائب گھر کے مخصوص حصوں میں تاریخی نوادرات ۔"

(رامزے میور)

تاریخ کا ہر عہد جہاں تہذیب و تمدن کے دوسرے شعبوں کے ساتھ زبان پر بھی اپنے مخصوص اثرات چھوڑ جاتا ہے وہاں ہر زمانے میں بدلتے ہوئے ماحول کے زیر اثر کتنے ہی پرانے الفاظ متروک ہوجاتے ہیں اور کتنے نئے الفاظ زبان زد عام ہوجاتے ہیں ۔ زبان کے دامن میں پڑے ہوئے پھولوں کو دیکھ کر آسانی سے کہا جاسکتا ہے کہ یہ آریاؤں کے باغ کی نشانی ہے اور یہ گلشن یونان کی یادگار، وہ پھول چمنستان ایران سے چنا گیا ہے اور یہ پھول عرب کے نخلستان سے حاصل ہوا ہے ۔ آج ہم گلشن یونان سے چنے ہوئے پھولوں کا مختصر سا جائزہ لیں گے ۔ گو اب ان کی رنگت کافی حد تک بدل چکی ہے لیکن سرزمین یونان کی مخصوص خوشبو ان میں اب بھی بسی ہوئی ہے، جسے ہم دوسرے پھولوں سے متمیز قرار دے سکتے ہیں ۔

کہتے ہیں کہ سکندر اعظم آندھی کی طرح آیا اور بگولے کی طرح چلا گیا ۔ لیکن سکندر ایک فوج کا سپہ سالار ہی نہیں، ایک نئے عہد کا پیش رو بھی تھا ۔ اس کی ضرب کاری سے شرق و غرب کے درمیان اجنبیت کی سد سکندری پارہ پارہ ہو کر رہ گئی ۔ اس کے نصب کردہ سنگ میلوں کے سہارے کتنے ہی نئے مہم بازوں نے سرزمین ہند کا دروازہ آ کر کھٹکھٹایا اور اس طرح یہاں ہند یونانی حکمرانوں کے عہد کی داغ بیل ڈال دی ۔ نتیجۃً یہاں ایک ایسی نئی تہذیب نے جنم لیا جو کہ شرق و غرب کی مشترک روایات کی حامل تھی اور دونوں کے علم و فن کے امتزاج کا نمونہ ۔ اس عہد میں وادیٔ سندھ کی زبان بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی ۔ یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ اس دور میں ہماری زبان بالکل ایک نئے سانچے میں

ڈھل گئی، ہاں اس عہد میں پیدا ہونے والی لسانیاتی تبدیلیوں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

سکندر کی آمد : سنکدر اعظم نے وادیٔ سندھ میں مراجعت (۳۲۶ ق م) کے دوران یہاں چند ایک نئی چھاؤنیوں کی بنیاد رکھی جہاں یونانی سپاہیوں کی ایک بڑی تعداد کو آباد کردیا۔ نیز اپنے مقررکردہ صوبہ داروں کی معیت میں یونانی حفاظتی دستے تعینات کئے۔ لازماً یہ یونانی آپس میں اپنی مادری زبان میں ہی بات چیت کرتے ہوں گے لیکن جہاں تک مقامی آبادی سے راہ و رسم کا تعلق ہے اس کے لئے انہیں علاوہ اشاروں اور کنایوں کے کچھ حد تک مقامی زبان سیکھنی پڑی ہوگی۔ نیز وہ طبقہ جن کا شب و روز یونانیوں سے واسطہ پڑتا ہوگا، کئی یونانی الفاظ سے واقف ہوگئے ہوں گے۔ لیکن چونکہ سنکدر کے آنکھیں بندکرتے ہی وادیٔ سندھ میں یونانی بالادستی ختم ہوگئی اور چندر گپت موریا نے ایک نئی حکومت کی داغ بیل ڈال دی۔ اس طرح اس وقت یونانی زبان بھی سیاسی طور پر قریب قریب ختم ہوگئی۔ اس لئے اس دور کو لسانیاتی لحاظ سے کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں

۱۹۵ ق م میں دیمتریس کے حملے سے لےکر ۵۰ء میں ہرمیوس کی حکومت کے خاتمے یعنی ڈھائی سو سال کے عرصے تک یونانیوں کی سیاسی بالادستی کے ساتھ ساتھ یونانی زبان کو بھی حکمرانوں کی زبان ہونے کی حیثیت حاصل رہی۔ ھند یونانی عہد میں دربار اور سرکاری کاروبار کے لئے یونانی اور مقامی دونوں زبانیں مستعمل تھیں جس کا اندازہ ہم اس عہد کے سکوں کی تحریروں سے لگا سکتے ہیں جن کے ایک طرف یونانی زبان، یونانی حروف ابجد میں اور دوسری طرف مقامی زبان خروشتی رسم الخط میں کندہ ہے۔ یہ ضرور ہے کہ یونانی نسل کے حکمرانوں نے روز مرہ کا کام چلانے کے لئے مقامی زبانیں سیکھنے کی کوشش کی ہوگی لیکن دربار اور سرکار میں جو درجہ حاکموں کی زبان کو حاصل ہوتا ہے وہ مقامی زبانوں کو نصیب نہیں ہوتا۔ قبل از اسلام یہاں ہندو عہد میں گو عوام کی زبان مختلف پراکرتوں پر مشتمل تھی لیکن شاہی دربار میں سنسکرت کا طوطی بولتا تھا۔ مسلمان آئے تو عربی فارسی کی قدر ہونے لگی اور کتنے ہی برہمن بھی دربار میں عزت حاصل کرنے کے لئے ان زبانوں کے ودوان بن گئے۔ انگریز آئے تو انگریزی زبان کے پھریرے لہرانے لگے اور ہر کہ و مہ نے انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے لئے کمر باندھ لی۔ علما تو ایک طرف دیہات کے ناخواندہ عوام کی زبان سے بھی روز مرہ کی بات چیت میں انگریزی زبان کے بگڑے ہوئے الفاظ سنائی دینے لگے جیسے، کہ فس کلاس، ٹائم، نمبر، فنڈ، ووٹ، ممبر، ٹمپریلی۔ اسکول، اشٹام، ہوٹل، ٹکٹ، ہسپتال، سنیما، اسٹیشن وشیرہ وغیرہ۔ اگر اس قسم کے الفاظ کو جمع کیا جائے تو ایک ضخیم لغت تیار ہوسکتی ہے۔

یونانی زبان کا دور دورہ : یونانی زبان کی داستان ھند یونانی شہزادوں کی حکومت کے ساتھ ہی ختم نہیں ہوجاتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد میں یا تو زبان عوام میں اتنی زیادہ مقبول ہوچکی تھی کہ آنے والے حکمران بھی اسے ختم نہ کرسکے یا

پھر اس نے سرکاری کاروبار پر اتنا گہرا تسلط جما لیا ہوگا کہ بعد میں بھی اسے قائم رکھے بغیر کوئی اور چارہ کار نظر نہ آیا۔ مہاراجہ کنشک اور اس کے جانشینوں کے عہد [۱۲۰ء تا قریباً ۳۰۰ء] میں سکوں پر خروشتی اور براہمی کے ساتھ ساتھ یونانی تحریر بھی استعمال ہوتی رہی۔ سابق شمال مغربی سرحدی صوبے کے دور دراز علاقوں سے بعض ایسے قیمتی پتھروں کے نگینے دستیاب ہوئے ہیں جن پر یونانی دیومالا کے کردار منقش ہیں اور ان پر یونانی عبارت کندہ ہے۔ اسی طرح ایسی پتھر کی لوحیں بھی دستیاب ہوئی ہیں جن پر یونانی عبارت مرقوم ہے۔ یہ پشاور اور لاہور کے عجائب گھروں میں محفوظ ہیں۔

ختن اور چینی ترکستان کی کھدائیوں کے دوران جو اشیا دستیاب ہوئی ہیں ان میں علاوہ سنسکرت، خروشتی اور براہمی زبان کی تحریروں کے یونانی زبان کی تحریریں بھی ہیں۔ محققین کی رائے ہے کہ یہ تحریریں گپتا خاندان کے عہد سے تعلق رکھتی ہیں۔ یقیناً وادیٔ سندھ کے نوآباد کار نقل مکانی کرتے وقت یہ زبان اپنے ساتھ لیتے گئے ہوں گے۔ روسی ماہرین کی ایک رپورٹ کے مطابق " اس علاقے میں آج بھی ایسے قبائل آباد ہیں جو وادیٔ سندھ کی موجودہ زبانوں سے ملتی جلتی زبان استعمال کرتے ہیں۔"

اس طرح وادیٔ سندھ میں یونانی زبان کا دور پانچ ساڑھے پانچ سو سال کے طویل عرصے تک جا پہنچتا ہے۔ کیا یہ ممکنات سے ہے کہ اس طویل عرصے میں یونانی زبان نے مقامی زبانوں کو بالکل متاثر نہ کیا ہو؟ یہ قانون فطرت کے خلاف ہے۔ کیسے ممکن ہے کہ دو دھارے ایک ہی راستے پر چلیں اور آپس میں نہ ملیں۔ دو تہذیبیں ایک ہی سرزمین میں پرورش پائیں اور ایک دوسرے سے متاثر نہ ہوں؟

یقیناً اس عہد میں کتنے ہی یونانی الفاظ یہاں کی روزمرہ کی زبان میں شامل ہوگئے ہوں گے۔ ان میں سے کچھ تو مرور زمانہ سے محو ہوگئے پھر بھی کچھ الفاظ ضرور ایسے ہوں گے جو ہماری زبان کا ایک حصہ بن گئے۔ آج ان کی شکل کچھ ایسی بدل چکی ہے اور یہ گھس پس کر ہماری زبان میں اس طرح ڈھل چکے ہیں کہ ان کا پہچاننا مشکل ہے۔ ان پر غیریت کا گمان تک نہیں ہوتا۔ پھر بھی اگر کوشش کی جائے تو ان الفاظ کا متمیز کرنا ناممکنات سے نہیں ہے۔

یونانی اور پنجابی کا باہمی رشتہ ناطہ:

یہاں اس امر کا ذکر کر دینا بھی ضروری ہے کہ وادیٔ سندھ میں چار قسم کے یونانی الفاظ ملتے ہیں۔ اول وہ الفاظ جو آریائی زبانوں کا مشترک سرمایہ ہونے کی حیثیت سے سنسکرت اور یونانی دونوں میں پائے جاتے ہیں، گو مقامی زبانوں میں یہ یونانی سے نہیں آئے۔ دوسرے وہ الفاظ ہیں جو عربی اور فارسی کی راہ سے وادیٔ سندھ میں وارد ہوئے۔ تیسری قسم کے وہ یونانی الفاظ ہیں جو مغربی زبانوں خاص کر انگریزی زبان کے ذریعے ہماری زبان میں داخل ہوئے۔ چوتھے وہ الفاظ ہیں جو ہند یونانی عہد یا اس کے بعد براہ راست یونانی زبان سے منتقل ہوکر ہماری زبان کا ایک حصہ بن گئے۔

یونانی الفاظ قافلہ افرنگ کے ہمراہ: سب سے پہلے ہم ان الفاظ کا ذکر کرتے ہیں جو مغربی اقوام کے ذریعے ہماری زبان میں آئے۔ سائنس، انجینیری اور ڈاکٹری کی اصطلاحات تو زیادہ تر یونانی الفاظ پر ہی مشتمل ہیں اور ان کو یک جا کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہوسکتی ہے۔ یہاں مشتے نمونہ از خروارے کے مصداق صرف چند الفاظ قارئین کی خدمت میں پیش کیے جاتے ہیں۔ جیسے کہ اسکول، اکادمی، کمرہ، کیمرہ، ڈراما، تھیٹر، کارک، گراموفون، فوٹوگراف، ٹیلگراف، ٹیلیفون، کارڈ، کیلنڈر، گرامر، جغرافیہ، جیومیٹری، پتلون، پالیسی، ڈیموکریسی، پروگرام، ایٹم وغیرہ۔

عرب و یونان کے تعلقات: اب ہم ان یونانی الفاظ کا ذکر کرتے ہیں جو عربی زبان کے ذریعے اردو اور پنجابی میں وارد ہوئے۔ عربوں اور یونانیوں کے تعلقات کی داستان بذات خود ایک طویل مضمون ہے۔ عرب اور یونان جغرافیائی لحاظ سے ایک حد تک پڑوسیوں کا درجہ رکھتے ہیں۔ علاوہ ازیں عرب اسی شاہراہ پر آباد تھے جہاں سے یونانی جہاز رات شب و روز گزرتے تھے۔ بدھ مذہب کی کتاب "مسائل" میں مینانڈر کے عہد [۱۵۵ تا ۱۳۰ ق م] میں اور یونانیوں کے ساتھ ساتھ عرب جہاز رانوں اور تاجروں کا "وادی" سندھ کے شہروں میں موجود ہونا مذکور ہے۔ اس کی تائید پہلی صدی عیسوی کے مشہور بحری سفر نامہ "بحیرہ قلزم کی سیر" [PERIPLUS] سے بھی ہوتی ہے جس میں کئی جگہ تجارت پیشہ اور جہاز راں عربوں کا ذکر آتا ہے۔

حضور نبی کریم صلعم کی ولادت کے وقت حضور کے ماموں چین میں تجارت کی غرض سے گئے ہوئے تھے جہاں اس وقت عرب تاجروں کی ایک چھوٹی سی بستی موجود تھی۔ "چین میں سب سے پہلی مسجد کانٹن میں ۶۲۷ء میں یعنی حضورصلعم کی وفات سے پانچ سال قبل تعمیر ہوئی تھی۔" [چین میں اسلام از یانگ ایوجان] بلکہ ایک تاریخ داں نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ "چند عرب جہاز ۳۰۰ء میں کانٹن اور ہانگ چاؤ کی بندر گاہوں پر پہنچے۔" ["سرزمین ایشیا اور اس کے لوگ"، از جی۔بی۔کریسی G B. CRESSEY] جنوبی ہند میں بھی زمانہ قدیم سے ہی عربوں کی آمد و رفت کا پتا چلتا ہے۔ خاص کر وہاں پہلی صدی عیسوی میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری سینٹ ٹامس کی آمد اور وہاں پر شامی عیسائیوں اور یہودیوں کا از منہ قدیم سے ہی موجود ہونا اس امر کا بین ثبوت ہے۔

حضور صلعم کے زمانے میں بھی عرب قافلے تجارت کی غرض سے ملک شام کا سفر کرتے تھے۔ خود حضور صلعم بھی بعثت سے قبل حضرت خدیجہ رض کا مال لے کر ان قافلوں کے ہمراہ تجارت کی غرض سے جاتے تھے۔ ان دنوں گو شام اور اس سے ملحقہ علاقے رومن سلطنت میں شامل تھے لیکن وہاں کی فضا یونانی تہذیب و تمدن سے گہرے طور پر متاثر تھی۔ ان حالات میں بعض یونانی اور لاطینی الفاظ کا عربی زبان میں شامل ہوجانا بعید از قیاس نہیں۔ نیز اپنے عروج کے زمانے میں جب

عرب دانشور یونانی علم و حکمت کی کتابوں کا ترجمہ کر رہے تھے تو انھوں نے بعض یونانی الفاظ کو جوں کا توں اپنی اصلی شکل میں رہنے دیا ۔ (۱) ذیل میں ایسے عرب و یونانی الفاظ کی ایک مختصر سی فہرست دی جاتی ہے جو پنجابی اور اردو زبان میں بھی مستعمل ہیں :-

پنجابی	ردو	عربی	یونانی		یونانی الفاظ کے معنی
کنون	قانون	قانون	کانون	KANUN	قانون ، چھڑی
دپھتر	دفتر	دفتر	دپھتھرا	THEPHTHERA	باریک کاغذ یا جھلی جو کہ زمانہ قدیم میں لکھنے کے کام آتی تھی ۔
دم	درہم	درہم	درہمؔ	DRACHMA	ایک یونانی سکہ اور وزن کا نام
ویلا	قرن	قرن	خرانو	KHRONOS	زمانہ
پردیسی	اجنبی	اجنب	زینو	ZENOS	غریب الوطن ، اجنبی
صوفی	صوفی	......	سوفو	SOPHOS	دانشور ، عقلمند [کہ نہیں سکتے کہ آیا یہ لفظ عربی کے ذریعہ آیا یا فارسی کے]
جوان	شاب	شاب	ہبب	HEBE	جوان
تلوار	سیف	سیف	زیفو	XIPHOS	تلوار
کھیتی	زراعت	زرع	اگرو	AGROS	کھیت
بلغم	بلغم	بلغم	پھلگم	PHLEGAM	بلغم
جراح	جراح	الجراح	چیرو	CHEIRO	ہاتھ کا کام کرنے والا ، چیر پھاڑ کرنے والا
کیمیا	کیمیا	الکیمیا	کیمیا	CHEMEIA	کیمیا
اکسیر	اکسیر	الاکسیر	کسیران	XERON	سفوف ، دوائی
عطار	عطار	عطار	ائتارو	IATROS	پنساری ، دوا فروش
جادو	طلسم	طلسم	تلسما	TELESMOS	جادو
گرجا	کلیسہ	کلسہ	اکلیسیا	EKKLESIA	اکٹھے ہونے کی جگہ ، گرجا
تبوت	تابوت	تابوت	تاپھو	TOPHOS	مقبرہ
کفن	کفن	کفن	کوپھیو	KOPHINOS	مردے رکھنے کے لئے صندوق یا ٹوکرا

وثوق سے نہیں کہا جاسکتا کہ آیا عربی کے لفظ ' حجّ ' اور یونانی حاجیو [HAGIOS] بمعنی مقدس ، متبرک میں کوئی رشتہ ہے یا نہیں ۔ اسی طرح عربی ' یاجوج ' سے یونانی جیجا [GIGAS] بمعنی دیو قامت ، عظیم الجثہ کی طرف خیال جاتا ہے ۔

ایران اور یونان : گو ایرانی اور یونانی لسانیاتی رشتے

(۱) یونانی الفاظ میں آخری ' س ' [S] کی آواز عام طور پر ساقط ہوتی ہے ، اس لئے یہاں اور اس مضمون میں آیندہ بھی تلفظ بیان کرتے وقت اسے حذف کردیا گیا ہے ۔

کی بنا پر آریائی گروہ کی دو بڑی شاخیں ہیں ۔ جغرافیائی لحاظ سے بھی یہ دونوں ایک دوسرے کے پڑوسی واقع ہوئے ہیں ، لیکن قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ یہ دونوں بھائی آپس میں ہمیشہ برسر پیکار رہے ۔ ان کی باہمی چپلقش تاریخ عالم کا ایک اہم باب ہے ۔ اسکندر یونانی کے حملے کے بعد خانوادہ سیلوکس کو ایک عرصے تک سرزمین ایران پر بالا دستی حاصل رہی ۔ اس سے جہاں زندگی کے دیگر شعبے متاثر ہوئے وہاں زبان کے معاملے میں بھی باہمی لین دین کا ثبوت ملتا ہے ، جیسے کہ :۔

پنجابی	اردو	فارسی		یونانی	یونانی الفاظ کے معنی
کشتی	ناؤ	ناؤ	ناؤ	NAVOS	کشتی
عطر	عطر	عطر	آئتھر	[AITHER]	دیوتاؤں کا سانس ، بارش ، آنسو [گو پنجابی زبان میں اس سے ملتا جلتا لفظ انھر یا اتھرو بمعنی آنسو بھی موجود ہے لیکن غالباً یہ سنسکرت کے لفظ اشرو بمعنی آنسو سے متعلق ہے]
سنگیت	موسیقی	موسیقی	موشیکا	MOUSHIKOS	موسیقی
......	ققنس	ققنس	ککنوس	KUKNOS	ہنس
......	زمرد	زمرد	زمرد	SMARAGDOS	ایک قیمتی پتھر
جھڑفلوس	فانوس	فانوس	پھانوس	PHANOS	چراغ ، چمک‌دار
چابی	کلید	کلید	کلیدو	KLEIDOS	چابی
حربوزہ	، خربوز	خربز	کرپوس	KARPOS	پھل

ہند آریائی ورثہ : یہ تو ایک مسلمہ امر ہے کہ یونانی اور سنسکرت دونوں ایک ہی سلسلے کی دو کڑیاں ہیں ۔ گو یہ قصہ ابھی تک زیر بحث ہی ہے کہ ان کی اصل وسط ایشیا میں یا مرکزی یورپ میں یا ان کا آبائی وطن بحر منجمد شمالی تھا یا شمال مشرقی یورپ ۔ بہرحال یہ قبیلہ شروع میں کسی ایک ہی چراگاہ میں آباد تھا ۔ وہاں اچانک کسی وجہ سے سب نے جلا وطن ہونے کی ٹھان لی ۔ اپنی اپنی بھیڑ بکریاں اور گھوڑے سنبھال کر جدھر جس کا منہ اٹھا چل دیا ۔ نئے دیشوں کے نئے ماحول سے لب و لہجہ میں تبدیلی آگئی ۔ مقامی لوگوں کے ساتھ گھلنے ملنے سے زبان بھی بدل گئی ۔ گو آج ہزاروں سال بیت چکے ہیں اگر ان زبانوں کا نظر غائر سے مطالعہ کیا جائے تو ان میں بنیادی مشابہت اور مطابقت واضح طور پر سامنے آجاتی ہے ۔ اس کی کئی مثالیں لسانیات سے معمولی شد بد رکھنے والے حضرات کو بھی معلوم ہیں ۔ یہاں زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والی چند

مثالیں پیش کی جاتی ہیں :-

اردو	پنجابی	سنسکرت	یونانی		فارسی	آریائی کنبہ کی دوسری زبانیں
ستاں	تھاں	ستھان	جتھان	CHTHON	ستان	
گاؤں	گراں	گرام	کام	KŌMĒ	گم	
در	دوارہ	دوار	تھورا	THORA	در	روسی : دوئر ، آئسلینڈی: وئر
مندر	مندر	مندر	منتھر	MANTHRA	......	لاطینی : مندرا
آنکھ	اکھ	اکشی	ہاشے	HASHSHE	——	روسی : اکو ، آئسلینڈی : اوگا
ابرو	بھروٹے	بھرو	اپھرو	APHRUS	ابرو	روسی : بروو
بازو	باہاں	باہو	پازو	PAZUS	بازو	
آواز	واج	واک	ایپاس	EPOS	آواز	لاطینی: واک
افعی	سپ	اہی	اوپھی	OPHI	افعی	
ہنس	ہنس	ہنس	چین	CHEN	——	لاطینی : انسر ، جرمن : گنس
بھینسا	سان ، سنڈا	مہیش	بشان	BISHON		لاطینی : بسان ، جرمن : وسنڈ
گھوڑا	گھوڑا	اشو	ہپ	HIPPOS	اسپ	
گوبر	گوہا	گوبر	کو پرو	KOPROS	براز	
زمین	بھوئیں	بھومی	زے	GE	زمین	لاطینی : ہومی
بہار	بسنت	وسنت	ہار	HAR	بہار	آئسلینڈی : وار ، روسی : ویسنا
پروا	پرا	پوروا	بوریا	BOREAS	——	سلاوی : برا ، وینسی : بورا
پتی	پتی	پتی	پوتیس	POTES	زند:پائتس	لاطینی : پوتس
دیو	دیو	دیو	تھیو	THEOS	دیو	لاطینی : تھیو
راجہ، رئیس	راجہ	راجن	ریجن	REGIEN	رئیس	لاطینی : ریکس، جرمن : دئش
برس	ورہ	ورش	ورو	WROS	زند:یار	آئسلینڈی : آر
زرد	پیلا	پلیتا	پولیو	POLIOS		لاطینی : پلیدوس
مزدوری	مجوری	——	مزدو	MIZDOS	مزد	روسی : مزدہ ، گاتھی ، مزدو
شہد	مِٹھا	مدھو	میڈو	MEDU	شہد	جرمن: متھ ، آئسلینڈی . میدا
آب حیات	امرت	امرت	امبرتو	AMBROTOS	——	
بھو	نونہہ	سنوشہ	نوؤ	NOUS	——	لاطینی : نووس، سلاوی : سنوچہ
خسر، سسر	سوہرا	شواشرا	اکورو	EKUROS	خسر	لاطینی : سوسر
تین	ترے	ترئیاس	ترئس	TREIS	——	روسی: تری ، لاطینی : تریس

سات	ست	سپت	ہپت	HEPTA	ہفت	لاطینی : سپتم ، تھوانی: سپتنی
دس	دس	داشا	ڈیکا	DEKA	دہ	لاطینی : دسم، آئسلینڈی : تیو
سو	سو	شتم	ایکتان	EKATON	صد	لاطینی : سنتم، روسی : ستو
سرخ	رتہ	رُدھرا	ایرتھرو	ERUTHROS	——	لاطینی: 'ردھرو' آئسلینڈی: رؤدر
بھورا	بھورا	ببھرو	بھرونو	PHRUNOS	——	تھوانی : بروناس

پنجابی عورتوں کی یونانی زبان: عورت فطری طور پر قدامت پسند اور ایک حد تک لکیر کی فقیر واقع ہوئی ہے۔ آج بھی کئی ایسے متحجّر الفاظ جنہیں روز مرہ کی زبان سے متروک ہوئے صدیاں بیت چکیں ، عورتوں کی زبان پر جاری و ساری ہیں۔ عام بول چال میں اکثر وہ ایسے الفاظ استعمال کر جاتی ہے کہ آپ ان کے معنی پر غور کرتے ہی رہ جائیں ۔ یہ الفاظ اسی طرح اس نے اپنی ماں سے سنے تھے اور اس کی ماں نے اپنی ماں سے اور ہزاروں سال سے سینہ بہ سینہ منتقل ہوتے آئے ہیں ۔ اس کی چند مثالیں آپ ایک سابقہ مضمون " وادی سندھ میں دراوڑی زبان کی باقیات" ["اردو نامہ" شمارہ ششم ۱۹۶۱ء] میں ملاحظہ کر چکے ہیں ۔

پنجاب کے دیہاتوں میں اگر بچے ماں سے دودھ پینے کے لئے بار بار تقاضہ کریں تو وہ تنگ آکر کہتی ہے "جرا ساہ لئو ہنے نیکڑو دے دنی آں" [ذرا سانس لو ابھی نیکڑو دے دیتی ہوں] ۔ اسی طرح اگر کوئی شیر خوار بچہ تمام دن ماں کے پستانوں کو چمٹا رہے تو وہ تنگ آکر کہتی ہے " ایہناں وچ کی سارا دن نیکڑو پیا اے " [ان میں کیا تمام دن "نیکڑو" پڑا ہے] ۔ یہ لفظ "نیکڑو" یونانی زبان کے نیکٹار [NEKTAR] بمعنی "دیوتاؤں کا مشروب " یا " شہد " کی بدلی ہوئی شکل ہے ۔

چولستان کے علاقے میں ایک دفعہ کسی باہر کے علاقے سے آئی ہوئی عورت نے ایک جوان لڑکی کو " کڑئیے " کہہ کر بلایا تو اس لڑکی کی ماں اس عورت سے لڑنے کے لئے تیار ہوگئی کہ تو میری لڑکی کو "کُڑی" کہنے والی کون ہوتی ہے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اس علاقے میں بہو کو "کُڑی" کہتے ہیں ۔ گو باقی پنجاب میں ہر چھوٹی بہن بیٹی کو "کڑی" کہہ کر پکارتے ہیں۔ ایسا معلوم دیتا ہے کہ اس علاقے کے لوگ کسی گزرے ہوئے زمانے میں یہاں بسنے والے یونانیوں کی لڑکیوں سے تو شادی کر لیتے ہوں گے لیکن ان کے ساتھ اپنی بہن بیٹی کا رشتہ کرنا معیوب تصور کرتے ہوں گے ۔ اس طرح یہاں "کَڑی" کا لفظ صرف 'بہو' کے معنی کے ساتھ چسپاں ہو کر رہ گیا ۔ کیونکہ یونانی میں لڑکی کو کوری [KORE] کہتے ہیں جس سے کہ پنجابی لفظ "کڑی" مشتق ہے ۔ غالباً "گڑیا" (پنجابی "گڈی") بھی اسی لفظ سے تعلق رکھتی ہے ۔ یورپ کی کچھ زبانوں میں لڑکی کے لئے اس سے ملتے جلتے الفاظ ملتے ہیں ۔

جیسے کہ جرمنی اور ھالینڈ کے کچھ علاقوں میں لڑکی کو "گور" [GOR] یا گوری [KORE] کہتے ہیں - اور سوئٹزرلینڈ میں اس کے لئے "گرّی" [GURRE] کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ اسی طرح پنجابی کا لفظ 'کواری' (کنواری) بھی یونانی کے لفظ "کورینا" [KORINNA] بمعنی نا کتخدا سے مشتق معلوم ہوتا ہے۔

لوک کہانی : پنجاب کی عوامی کہانیاں یونانی روایات سے کہاں تک متاثر ہوئی ہیں، اس کا کچھ اندازہ اس مقبول عام کہانی سے لگایا جاسکتا ہے جس کا ہیرو شہزادہ اپنے ملک سے جلاوطن ہوکر چلتا چلاتا، ندی نالے، پہاڑ صحرا عبور کرتا ایک ایسے لق و دق میدان میں پہنچ جاتا ہے، جہاں آدم نہ آدم زاد۔ آخر دور کچھ ٹوٹے پھوٹے سے کھنڈر نظر آتے ہیں - وہاں ایک خوفناک ڈائن کے ہتھے چڑھ جاتا ہے جو اسے ایک کمرے میں بندکر کے ڈھول بجانے پر مامور کردیتی ہے کہ ذرا بھی رکے تو آکر ایک دم ہڑپ کر جاؤں گی۔ آخر ایک چوھا ترس کھا کر اسے ایک عقبی دروازے سے بھاگ جانے میں مدد دیتا ہے اور اس دوران میں خود اپنی دم سے ڈھول بجاتا رہتا ہے۔

چلتے چلتے ایک ایسے جنگل بیابان میں پہنچتا ہے جہاں دور دور تک آبادی کا کوئی نشان نہیں۔ بھوک پیاس نے تنگ کر دیا ہے۔ ایک ٹیلے پر سے ایک طرف دور سے دھواں نکلتا ہوا دیکھ کر وہاں پہنچتا ہے تو ایک عالیشان قلعہ سامنے نظر آتا ہے۔ اندر جانے کے بعد ایک نہایت ہی حسین و جمیل دوشیزہ بیٹھی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ وہ اسے دیکھ کر پہلے ہنستی ہے پھر روتی ہے۔ وجہ دریافت کرنے پر بتلاتی ہے کہ ہنسی اس لئے کہ بڑی مدت کے بعد ایک آدم زاد نظر آیا، روئی اس لئے کہ شام کو کانا دیو آکر تمہیں اپنا لقمہ بنا لے گا۔ شاہزادہ اس کانے دیو کو مار دینے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔

آگے بڑھتا ہے تو ایک جگہ ایسا اجڑا شہر ملتا ہے جس کے مکینوں کو باشک ناگ نے بھسم کر لیا ہے - شہزادہ اس باشک ناگ کو ٹھکانے لگا کر آگے چل پڑتا ہے۔ چلتے چلتے ایک جنگل بیابان میں شام ہوجاتی ہے۔ وہ تھکاھارا ایک درخت کا سہارا لے کر سوجاتا ہے۔ آدھی رات ادھر آدھی رات آدھر، درخت پر کسی پرندے کے بچوں کا شور وغل سن کر اس کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ دیکھتا کیا ہے کہ ایک عظیم الجثہ سرال ان بچوں کو کھانے کے لئے اوپر چڑھا جارہا ہے۔ وہ تلوار کے وار سے اس کے تین ٹکڑے کر کے سرھانے رکھ لیتا ہے۔ صبح چکوا اور چکوی آجاتے ہیں - وہ بچوں سے رات کا سارا قصہ سن کر شہزادے کے دوست بن جاتے ہیں۔

اس کہانی میں ڈائن کا لفظ یونانی ڈائنو [DEINOS] بمعنی خوفناک، مہیب وغیرہ کی ہی ایک شکل ہے۔ کانا دیو یونانی دیو مالا کا کائیکلوپ [KYKLOPES] بمعنی ایک آنکھ والا دیو ہے جس کا مقابلہ ہر قلیس کے ساتھ ہوا تھا۔ یاد رہے کہ سنسکرت کا لفظ 'دیو' بمعنی خدا، فرشتہ وغیرہ ہمیشہ نیکی اور تقدس کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس کے برعکس یونانی دیو مالا میں اچھے اور برے دونوں طرح کے دیو نظر آتے ہیں، اس لئے یہ لفظ 'دیو' گو

سنسکرت میں بھی موجود ہے لیکن عوامی کہانیوں کا دیو، یونانی روایات کا آئینہ دار ہے۔ باشک ناگ یونانی باشیلیکو [BASHILIKOS] بمعنی شاہی ناگ کی ہی بدلی ہوئی شکل ہے۔ بھچھ کرنا بھی یونانی پھیجئین [PHAGEINE] بمعنی 'کھانا' سے مشتق نظر آتا ہے۔ سرال یونانی زبان کا ساروا [SAVROS] بمعنی 'مگرمچھ' کی قسم کا بڑی جانور ہے۔ چکوا اور چکوی بھی کچھ اسی قسم کے نام نظر آتے ہیں کیونکہ ہمارے ملک میں اس نام کا یا اس سے ملتا جلتا کوئی پرندہ دیکھنے میں نہیں آیا۔

لوک کہانیوں میں جب کسی شہزادی کا ہار گم ہوجاتا ہے تو وہ ہمیشہ نولکھا ہار ہوتا ہے۔ کبھی نو ہزارہ یا دس لکھا نہیں۔ اصل میں یہ ' نولکھا ، یونانی نشکو [NISHKOS] یونانی دیو مالا میں ایک قیمتی ہار کی ہی دوسری شکل ہے۔ ہماری لوک کہانیوں کا پارس پتھر کہ جس کی رگڑ سے لوہا سونے میں تبدیل ہوجاتا ہے، یونانی پارسون [PARSON] یعنی یونانی روایات میں ایسا سبز پتھر جس کی رگڑ سے دھاتیں سونا بن جاتی ہیں۔

پنجابی لوک کہانیوں میں 'بکّی' بمعنی تیز رو گھوڑی کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ خاص کر مرزا کی بکّی تو زندہ جاوید بن چکی ہے۔ آج اہل پنجاب اپنی ہر اچھی گھوڑی کو پیار اور فخر سے بکّی کے نام سے پکارتے ہیں۔ غالباً یہ بکّی سکندر اعظم کے گھوڑے " بوکا فیلس " بمعنی "ہرنی کا بیٹا" کی یادگار ہے۔

پنجابی زبان میں یونانی عنصر: اس سے قبل ہم ایک دوسرے مضمون میں بیان کرچکے ہیں کہ پنجابی لفظ تکھان بمعنی بڑھئی، دراوڑی زبان میں انہی معنوں میں مستعمل لفظ تکّان سے مشتق ہے (وادی سندھ میں دراوڑی زبان کی باقیات)۔ عجیب اتفاق ہے کہ ہومر کے زمانے کی یونانی میں اس سے ملتا جلتا لفظ تکتان [TEKTON] بمعنی بڑھئی، جہازساز اور معمار ملتا ہے۔ وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ آیا یہ مماثلت محض اتفاق ہے یا ان میں باہم کوئی رشتہ موجود ہے۔ لیکن یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ بڑھیوں کے ایک اہم اوزار 'گنیا'، کی اصل یونانی لفظ "گونیا" [GONIA] بمعنی کونے ماپنے والا آلہ ہی ہے۔ اس طرح یہ بھی کہنا مشکل ہے کہ آیا لفظ ' بیٹھک ، کا یونانی لفظ ایٹک [ATTIKOS] بمعنی چھوٹا کمرہ سے کوئی تعلق ہے یا نہیں۔

اسی طرح اور بھی کئی یونانی الاصل الفاظ ہیں جو پنجاب کی روزمرہ زبان میں مستعمل ہیں۔ ذیل میں ایسے الفاظ کی ایک مختصر سی فہرست دی جاتی ہے:

یونانی الفاظ مع معنی	پنجابی مترادف الفاظ مع معنی
نئین (NAEIN): بہنا	نیں: دریا یعنی بہنے والا
نیرو (NEROS): گیلا، نمدار	نیر: پانی
	نیرا: سبز چارہ

کوپ (KOPE): چپو	چپو
کوگھ (KOGCHE): گھونگھ	گھونگا : گھونگھ (سنسکرت : شنکھ)
کانّا (KĀÑNA): نرسل، سرکنڈا	کانّا : نرسل ، سرکنڈا
	گنّا : یعنی میٹھا نرسل
بوٹنی (BOTANE): پودا	بوٹی یا بوٹی : جڑی بوٹی ، چھوٹے پودے
کریان (KARUON): مغز	گری : گٹھلی، مغز
پائر (PYRE): آگ	بھاڑ : بڑا چولہا یعنی آگ جلانے کی جگہ
پائرسن (PYRESSON): گرمی	پڑے : گرمی
ہالا (HALOS): وہ دائرہ جو کہ غلہ گاھتے وقت بیلوں کے چلنے سے بن جاتا ہے - نیز وہ روشن دائرہ جو کہ بعض اوقات چاند یا سورج کے گرد نظر آتا ہے ۔	ہالہ : وہ روشن دائرہ جو کہ بعض اوقات چاند یا سورج کے گرد نظر آتا ہے ۔
گیرا (GYROS): چکر	گھیرا یا گھیر : چکر
کلما (KALMOS): قلم ، نرسل	قلم : قلم (فارسی میں قلم کرنا کے معنی قطع کرنا کے ہیں ۔ صوتی لحاظ سے فارسی کا لفظ خامہ بمعنی قلم اس یونانی لفظ سے منسلک ہے -)
ٹپر (TAPIR): غالیچہ ، دری ، گدی	ٹپڑ : ٹاٹ یا سرکنڈے کی گدی جس پر اسکول کے بچے یا ہندو بنئے بیٹھتے ہیں ۔
اورا (URA): دمْ	چورا یا چوری : بالوں کا بنا ہوا وہ دم نما پنکھا جو کہ مکھیاں اڑانے کے کام آتا ہے ۔
پھیلو (PHYLLUS): پتی، نیز چاقو یا تلوار وغیرہ کا پھل	پھل : چاقو یا تلوار وغیرہ کا منہ
	پھالا : ہل کی چو
کوٹیلی (KOTYLE): پیالہ	کٹوری : پیالہ نما برتن
کیلکس (KYLIX): پیالہ	کولی : پیالہ نما برتن
ارٹو (ARTOS): روٹی	روٹی : چپاتی نیز روٹ بمعنی بڑی روٹی - (یہاں بھی ہم کچھ مخمصے میں پڑجاتے ہیں کیونکہ دراوڑی زبانوں میں بھی روٹی کے لئے ملتا جلتا لفظ دوٹی موجود ہے جس کا مترادف پشتو کا لفظ ڈوڈئی بھی ہے) ۔ (ملاحظہ ہو ”وادیٔ سندھ میں دراوڑی زبان کی باقیات مطبوعہ اردو نامہ شمارہ ششم “) ۔
گورڈیلے (KORDYLE): کوڑا ، چھڑی	کوڑلہ : کوڑا

کُشتو (KAUSHTOS): جلا ہوا	کشتہ: علم طب کی اصطلاح میں کسی دھات یا جڑی بوٹی کو جلا کر بنائی ہوئی دوا ۔ (فارسی میں کشتہ کے معنی مقتول کے ہیں)
ہیڈرا (HEDRA): چبوترہ ، بیٹھنے کی جگہ	تھڑا : چبوترہ ، بیٹھنے کی جگہ
کیکلو (KYKLOS): دائرہ	ککلی : بچوں کا دائرہ بنا کر گھومنے کا کھیل
اگورا (AGORA): لوگوں کے جمع ہونے کی جگہ، منڈی	اکھاڑہ: لوگوں کے جمع ہونے کی جگہ مثلاً پہلوانوں کا اکھاڑہ، ناچنے والوں کا اکھاڑہ وغیرہ
شورنگ (SHURING): کان ، سُرنگ	سُرنگ : زمین دوز راستہ
زنتھو (XANTHOS): زرد رنگ	بسنتی : زرد رنگ
ہائیگرو پیلو (HYGROS PELOS): بھیگی ہوئی مٹی مٹی بھیگی	گارا : بھیگی ہوئی مٹی
چائٹی (CHAITE) : عورت کے گوندھے ہوئے بالوں کا پیچھے لٹکتا ہوا حصہ	چوٹی : عورتوں کی چوٹی
سیوپ (SIOPE): خاموشی	چُپ
پھیلو (PHILOS): دوست	پیلی : دوست (اس کا قدیم تلفظ پیلی تھا جو کہ فی زمانہ بھی یورپی جپسیوں کی زبان میں مستعمل ہے)
پولو (POLOS): نوجوان گھوڑا ، بچھڑا	غالباً ککلی کی طرح بڑوں میں گھوڑوں پر چڑھ کر گیند بلا کھیلنے کا شوقہ بھی عہد یونانی کی یاد ہے ۔ اور نہیں تو کم از کم پولو کا نام تو ضرور یونانی اثرات کی غمازی کر رہا ہے ۔
پولیمو (POLEMOS): لڑائی	لام : لڑائی
انگاریڈ (ANGAREID) : زبردستی بغیر کسی معاوضہ کے کام لینا	ونگار : بیگار
لیپرس (LEPRIS) : پکڑنا	لپڑنا : پکڑنا
کوپ ٹئین (KOP-TEIN): کاٹ دینا کوپاّ (KOPPA): کٹا ہوا	کپنا : کاٹ دینا (ولندیزی اور جرمن کپن : کاٹ دینا)
بینن (BAINEN): جانا	ونّنا : جانا (یہ بھی لسانیاتی گورکھ دھندوں میں سے ایک ہے کیونکہ بعض دراوڑی زبانوں میں ہَن بمعنی جانا موجود ہے جس سے سندھی وڃ اور ملتانی ونج مشتق بتلائے جاچکے ہیں۔ ملاحظہ ہو" وادی سندھ میں دراوڑی

پیلیئن (PALAIENE): کشتی لڑنا
پالے (PĀLE): پہلوان کا فن

زبان کی باقیات'' مطبوعہ اردو نامہ شمارہ' ششم)
پہلوانی : کشتی کا فن
پہلوان : کشتی کرنے والا (گو بظاہر یہ لفظ سنسکرت کے لفظ بلوان بمعنی طاقتور سے مشابہ ہے ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ''بل'' کے ہوتے ہوئے بھی جب تک کوئی آدمی فن پہلوانی سے واقف نہ ہو پہلوان نہیں کہلا سکتا ۔ اس کے برعکس نسبتاً کمزور آدمی کشتی کے داؤ پیچ جانتا ہے تو وہ پہلوان ہے .)

چند یونانی الاصل الفاظ کی تشریح :

شیطان : گو اغلب یہی ہے کہ یہ یونانی تیتان سے مشتق نہیں ہے لیکن الفاظ کی مماثلث اور واقعات کی مطابقت کے پیش نظر عربی شیطان اور یونانی تیتان کا باہمی موازنہ پیش کرنے پر مجبور ہوگیا ہوں ۔ عین ممکن ہے کہ یہ مماثلث و مطابقت محض اتفاقی ہو کیوں کہ شیطان عبرانی کے لفظ 'سطن، بمعنی دشمنی کرنا، وغیرہ سے مشتق ہے۔ اس بارے میں واقعات اتنے مشہور عالم ہیں کہ یہاں ان کا دہرانا محض زائد ہوگا .

ماہرین کا کہنا ہے کہ اصل یونانی لفظ تیتو [TITO] بمعنی 'دن، ہے اور سنسکرت کے لفظ تتھا بمعنی آگ کے ساتھ تعلق رکھتا ہے . پنجابی تتا بمعنی گرم بھی اسی تتھا سے ماخوذ ہے .

یونانی دیو مالا میں یورانوس دیوتا اور جاتیا دیوی کی اولاد تیتان کہلاتی ہے . یہ دیوی اور دیوتا شروع میں عظیم المرتب دیوتاؤں میں شمار ہوتے تھے لیکن سب سے عظیم دیوتا زیوس کی پیدائش پر انہوں نے ناراضگی کا اظہار کیا جس کی پاداش میں انہیں بمع ان کی ذریات کے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دیوتاؤں کی سر زمین سے جلا وطن کر دیا گیا. اس کے بعد کئی دفعہ تیتانوں نے دیوتاؤں سے عنان حکومت چھیننے کے لئے نبردآزمائی کی جو کہ یونانی دیومالا میں 'جنات کی جنگ، [GIGANTOMACHIA] کے نام سے مشہور ہے، لیکن اس میں انہوں نے ہمیشہ منہ کی کھائی .

تیتانوں میں سب سے مشہور تیتان کا نام ہیلئیس [HELIOS] بمعنی مجسم آگ ہے اور اس بنا پر اسے سوریہ دیوتا بھی کہتے ہیں . عربی 'ابلیس، غالباً فنیقی 'بیل، بمعنی سورج دیوتا سے مشتق ہے. ویسے ہیلئس کی معرب صورت میں 'ہ، کی آواز کا 'ب ، کی آواز میں بدل جانا بھی ممکنات سے ہے .

یونان : آخر یونان کو یونان کیوں کہتے ہیں جب کہ مغربی ممالک میں یہ جزیرہ نما گریس [GREFCE] کے نام سے مشہور ہے ؟ اس کی وجہ بھی کچھ ایسی ہی ہے جیسا کہ دریائے سندھ کی نسبت سے ایک وقت پشاور سے کولمبو اور کراچی سے رنگون تک کا تمام علاقہ ہندوستان کے نام سے مشہور تھا. آج گو دریائے سندھ مغربی پاکستان میں

نہتا ہے لیکن اس کے نام کی چھاپ ستلج پار کے علاقے پر چسپاں ہے۔

شروع شروع میں ایشیائی اقوام کا جس مغربی قوم سے سب سے پہلے واسطہ پڑا، وہ ایشیائے کوچک کے جنوب مغربی ساحل کے قریب واقع ایونیا [IONIA] کے باشندے تھے۔ عرب و فارس میں یہ علاقہ یونان کے نام سے مشہور تھا اور اہل ہند اسے یاونا کے نام سے یاد کرتے تھے۔ گو ایونیا کے باشندے شروع میں جزیرہ نما ہی سے ہجرت کر کے یہاں پہنچے تھے لیکن جزیرہ نما کے باشندے انہیں غیر یونانی [NON GREEK] تصور کرتے تھے گو یونان کا مشہور شاعر ہومر، مشہور مورخ ھردوط اور تھیلس، انا شی میندر، ہیراقلیتس، اناشاغورث جیسے مشہور فلسفی اسی سرزمین سے تعلق رکھتے تھے جن پر آج بھی اہل یونان کو ناز ہے۔

حالات کی ستم ظریفی دیکھئے کہ آج ایونیا کا نام ایک قصہ' پارینہ کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ علاقہ موجودہ ترکی کا ایک حصہ ہے لیکن پھر بھی اسی کے نام کی نسبت سے جزیرہ نما گریس مشرقی اقوام میں یونان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

بت : پتھر کا مجسمہ ، مورتی ، عام طور پر ایسا مجسمہ جو کہ عبادت کے لئے مخصوص ہو۔ بت کدہ اور بت پرستی کے الفاظ بھی اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔

اس لفظ کی اصل (مہاتما) بدھ کا یونانی تلفظ معلوم ہوتا ہے۔ قدیم یونانی تحریروں میں مہاتما بدھ کو اکثر بوتا، بوتا اور بتا [BOUTTA BOTTA, BUTTA] کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔

شروع شروع میں مہاراجہ کنشک (۱۲۰ تا ۱۶۲ء) نے مہاتما بدھ کے مجسمے بنانے کے لئے باختریا اور پنجاب کے یونانی سنگتراش مقرر کئے جس پر آگے چل کر گندھارا کے فن سنگتراشی کی بنیادیں استوار ہوئیں اس فن کو اکثر بدھ اور یونانی فن کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ ضرور ہے کہ یہ یونانی سنگتراش ان مجسموں کو اپنی زبان میں بوتا یا بتا پکارتے ہوں گے۔ آج بھی پنجاب میں بتا کا لفظ پتلا کے معنوں میں مستعمل ہے بلکہ خود پتلا کا لفظ بھی اسی بتا سے مشتق معلوم ہوتا۔ مولانا محمد حسین آزاد نے 'بَت' کی ایک صورت 'بَد' بھی تسلیم کی ہے۔ (رک: قواعد اردو صفحہ ۲۵۲ مؤلفہ محمد حسین آزاد، مطبوعہ لاہور ۱۸۶۷ء)۔

اگر بت کے معنی محض بے جان مجسمے کے ہوتے تو یہ لفظ معبود اور معشوق یعنی قابل پرستش کے معنوں میں کبھی بھی استعمال نہ ہوتا۔ اس لئے اس بت کی اصل سوائے ایسے مجسمے کے اور کچھ نہیں ہو سکتی جو کہ معبود کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا ہو۔ گو شروع میں یہ نام صرف مہاتما بدھ کے مجسموں کے لئے مخصوص ہو گا لیکن بعد ازاں یہ نام عمومیت کا درجہ حاصل کر کے ہر مجسمے پر چسپاں ہونے لگا۔

تاریخ کے اوراق سے زمانہ' قدیم سے ہی ایران میں بدھ پرستی کا ثبوت ملتا ہے۔ کہانی

خاندان کے حکمران لہرا سپ کے تذکرے سے پتہ چلتا ہے کہ اس عہد میں توران کے علاقے میں بدھ مذہب پھیل چکا تھا۔ ساسانی عہد (۲۲۴ تا ۶۵۲۹ء) میں مشرقی ایران میں بدھ مذہب کے موجود ہونے کا ثبوت ملتا ہے ۔ طلوع اسلام کے بعد تک بھی بلخ میں بدھ مذہب کا ایک مندر موجود تھا جوکہ عوام میں ' نوبہار ' کے نام سے مشہور تھا ۔ شاپور اول کے عہد (۲۴۱ تا ۲۷۲ء) میں مانی کے مذہب کے بارے میں بھی عام طور پر یہی خیال پایا جاتا ہے کہ وہ بدھ مذہب کا چربہ تھا ۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بت پرستی کا ماخذ بدھ پرستی ہے اور بت مہاتما بدھ کا بگڑا ہوا تلفظ ۔

دام: بمعنی روپیہ پیسہ ، قیمت، زمانۂ گذشتہ میں ایک سکہ کا نام ۔

جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں وادیٔ سندھ میں ہند و یونانی عہد (۱۹۰ ق م تا ۵۰ ء) میں یونانی سکہ درہم [DRACHMA] مروج تھا ۔ ۸۰ یا ۹۰ء کے لگ بھگ اسکندریہ کے ایک نامعلوم رومی النسل باشندے نے اپنی بحری مہمات کے تذکرے " بحیرۂ قلزم کی سیر " [PERIPLUS] میں رقم کیا ہے کہ " قدیم دراھم جن پر کہ یونانی رسم الخط درج ہے اور (وادیٔ سندھ میں) سکندر اعظم کے جانشینوں کی شبیہیں منقوش ہیں، وہ باختر اور شمالی ہند سے چلتے چلاتے (ہندوستان کے) مغربی ساحل پر واقع بندرگاہوں میں آج بھی (بطور سکہ) رائج ہیں " ۔

قدیم پراکرت میں کفایت لسانی کی بنا پر درہم کے لفظ نے " داما " کی صورت اختیار کرلی (" اردو اور بنگالی " از ڈاکٹر شہیداللہ) ۔

انقلابات زمانہ کی لہروں پر بہتا ہوا یہ سکہ مغلیہ دربار میں ظاہر ہوتا ہے ۔ آئین اکبری میں مرقوم ہے کہ " دام کا وزن پانچ تنکہ یعنی ایک تولہ، آٹھ ماشہ اور سات رتی ہے ۔ (قیمت کے لحاظ سے) یہ روپے کا چالیسواں حصہ ہے " ۔

عجیب بات ہے کہ عہد اکبری میں حکومت کی آمدنی دام جیسے ادنیٰ سکے میں شمار کی جاتی تھی ۔ یہ طریقہ عہد جہانگیری میں بھی مروج رہا، جیسا کہ محمد شریف حنیجی نے ۱۶۲۸ء میں جہانگیر کے دور حکومت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ " شاہان دھلی کو تمام ممالک محروسہ سے سالانہ چھ ارب اور تیس کروڑ دام آمدنی ہوتی ہے " ۔ دمڑی اور دمڑے کے الفاظ اسی دام سے مشتق ہیں ۔

مرھٹی زبان میں ابھی تک تنخواہ کو " درماہ " کہتے ہیں ۔ جیسے " کورڈا درماہ " کے معنی ہیں فقط تنخواہ (کورادام : بمعنی صاف یا صرف) وہ مشاہرہ جس کے ساتھ روٹی ، کپڑا اور رہنا شامل نہ ہو ۔

پنجابی اور اردو گرامر پر یونانی اثرات : یہ موضوع کتنا عجیب اور بے سرو پا نظر آتا ہے؟ اس کی وجہ ہمارے ذہنوں میں بیٹھے ہوئے وہ نظریات ہیں جوکہ برصغیر کی باقی ماندہ زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو اور پنجابی زبانوں کو بھی سنسکرت کی ایک شاخ بتاتے ہیں ۔ گو بعض دفعہ دبی زبان میں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ براہ راست سنسکرت سے نہیں بلکہ

قدیم پراکرتوں سے نکلی ہیں، لیکن جب مجموعی طور پر برصغیر کے شمالی حصے کی زبانوں کی تقسیم کا سوال پیدا ہوتا ہے تو انہیں بے چون و چرا سنسکرت الاصل تسلیم کرلیا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم ان زبانوں کا واحد سرچشمہ صرف سنسکرت کو ہی باور کرلیتے ہیں، لیکن جب کسی نحوی ترکیب یا لغوی سلسلے کا سراغ سنسکرت میں نہیں ملتا تو بعض دفعہ نہایت ہی مضحکہ خیز اور دور ازکار تاویلات ایجاد کرنے کی کوشش کرتے ہیں. ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ ان زبانوں میں سنسکرت عربی اور فارسی کے علاوہ برصغیر کی آریاؤں سے پہلے کی زبانوں مثلاً دراوڑی اور منڈا زبانوں کا عنصر بھی موجود ہے. پھر آریاؤں کے بعد یونانی، ترکی، منگولی اور یورپی زبانیں بھی اپنے اپنے وقت میں یہاں کی زبانوں کو متاثر کرتی رہی ہیں۔

یہاں ہم پنجابی اور اردو زبان کی گرامر کے چند ایک ایسے پہلوؤں کا جائزہ لیں گے جن پر یونانی اثرات بالکل واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ گو اس کے لئے بہتر طریقہ تو یہ تھا کہ تقابلی صرف ونحو کی مدد سے سنسکرت، عربی، فارسی، دراوڑی منڈا اور یونانی صرف ونحو سے مثالیں دے کر اپنے مطمح نظر کو واضح کیا جاتا لیکن یہ بذات خود ایک علٰحدہ اور طویل موضوع ہے، نیز یہ پہلو ہنوز زیر مطالعہ ہے، اس لئے اسے کسی آئندہ موقع کے لئے اٹھا رکھتے ہیں۔ یہاں اپنے مفہوم کی وضاحت کے لئے صرف اشارات سے ہی کام لیا گیا ہے۔

اول ہم حروف ربط "کا، کے، کی" کی مثالیں لیتے ہیں۔ عربی، فارسی میں اس کی اصل نہیں ملتی۔ سنسکرت میں بھی حروف ربط کی جگہ جو لاحقے استعمال ہوتے ہیں وہ صوتی اور ساخت کے لحاظ سے بالکل مختلف ہیں. مثلاً بعض دفعہ تو بغیر کسی لاحقہ یا علامت کے ہی مطلب براری کرلی جاتی ہے. جیسے کہ 'وکرم سبھا' کے معنی ہیں 'بکرم کا دربار۔ عام طور پر صیغہ واحد کے لئے 'ئیہ' یا 'سیہ' کا لاحقہ استعمال کرتے ہیں، جیسے کہ 'پانینیہ وگیان' بمعنی پاتینی کی حکمت۔ 'امرتسیہ سر' بمعنی امرت یعنی آب حیات کا تالاب. اسی طرح تثنیہ کے صیغے کے لئے (جوکہ اردو میں مستعمل نہیں ہے) 'بھیام' اور جمع کے صیغے کے لئے 'نام' کا لاحقہ استعمال کرتے ہیں۔

جیسے کہ: پرش = آدمی

پرشا سیہ = آدمی کا

پرشا بھیام = دو آدمیوں کا

پرشا نام = (دو سے زیادہ) آدمیوں کا

قدیم پراکرت میں بھی گو حروف کا مفہوم موجود تھا لیکن وہاں بھی "کا، کے، کی" کی علامتوں کا نشان نظر نہیں آتا۔

جیسے کہ: آت دیپا شرن، آنند شرن
دھرم دیپا، دھرم شرن

اور نور حقیقی کی پناہ سب سے خوش کن پناہ ہے۔
دین حق ہی نور حقیقی ہے، دین حق کی پناہ میں آؤ۔
(داستان اردو از نصیر حسین خیال)

جب سنسکرت میں ان حروف ربط کی اصل نہ ملی تو پھر تاویلات کی تلاش شروع ہوئی ۔ آخر یہ قیاس کیا گیا کہ "اگرچہ بظاہر یہ حروف (یعنی حروف ربط) بہت سادہ معلوم ہوتے ہیں ۔ لیکن جب ان کی اصل پر نظر ڈالی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ سنسکرت میں مستقل الفاظ تھے لیکن زمانے کے تغیرات سے رفتہ رفتہ ایسے ہوگئے کہ اب وہ محض ایک سادہ علامت کا کام دیتے ہیں ۔ مثلاً 'کنے ، جو پرانی اردو میں ' پاس ، کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا ، اصل میں ' کرن ، یا ' کرنے ، سے ہے جس کے معنی ' کان ، کے ہیں ۔ چونکہ کان قریب کا عضو ہے ، اس لئے یہ معنی ہوگئے ۔ "

یاد رہے کہ ' کنے ، کا لفظ جو قدیم دکنی زبان میں مستعمل ہوا ہے ، حروف ربط (کا ، کے ، کی) کے معنی نہیں دیتا بلکہ سمت ، طرف یا پاس کے معنی دیتا ہے اور فی زمانہ بھی یہ لفظ پنجابی زبان میں انہی معنوں میں مستعمل ہے ۔ جیسے کہ " میرے کنیں " یعنی میری طرف " رب کنیں " یعنی خدا کی طرف ، " رب کنوں " بمعنی خدا کی طرف سے یا خدا سے ۔

سولھویں صدی عیسوی کے دکنی شاعر فیروز کی ایک ہی مثنوی میں ' کنے ، اور " کا ، کے ، کی " کے الفاظ مختلف معنوں میں استعمال ہوئے ہیں ۔

جیسے کہ: مرا پیر مخدوم جی جگ منے
منگوں لعمتان میں سدا اس کنے
پیا جیو نہے تو ھمن ساس ہے
تو ہم جیو کے پھول کا باس ہے

(دکنی ادب کی تاریخ ' از ڈاکٹر زور)

محققین نے ان حروف ربط کے بارے میں اور بھی کئی قیاسات پیش کئے ہیں ۔ ایک خیال یہ ہے کہ یہ پراکرت کی اضافتی علامت " کیر کم " اور ' کیرو ، سے ماخوذ ہے ۔ اس کی سند علاوہ قدیم دکنی اردو کے چند بردئی کی پر نھی راج راسو سے بھی ملتی ہے ۔ لیکن جیسا کہ ہم آگے چل کر بیان کریں گے ان حروف ربط کا استعمال بہت پرانا ہے ۔ اس طرح سے اور بھی کئی قیاس آرائیاں موجود ہیں جن کے بارے میں محترم ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اپنی فاضلانہ تصنیف " اردو زبان کا ارتقاء " میں تفصیل سے بحث کی ہے ۔

یہاں ایک اور غلط فہمی کا ازالہ بھی ضروری ہے کہ عام طور پر یہ باور کیا جاتا ہے کہ ان حروف ربط کا استعمال دکنی اردو سے ہی مخصوص تھا ۔ حالانکہ پنجاب میں اس کے استعمال کا ثبوت اس سے قدیم تحریروں میں ملتا ہے ۔ اس کی چند ایک مثالیں ذیل میں پیش کی جاتی ہیں :

بدھ مت کی ایک مذہبی کتاب میں جو کہ پالی زبان میں ہے ، ان حروف ربط کا ثبوت ملتا ہے ، جیسے کہ اس کتاب میں درج ذیل فقرے سے واضح ہے :

" دھام (دھرم) کرو ، دھام کا شنکھ پھونکو ، دھام کی ڈند مچاؤ ۔ " (یہ فقرہ داستان اردو ، مصنفہ نصیر حسین خیال مطبوعہ دکن سے منقول ہے جو کہ میں نے کسی لائبریری میں دیکھی تھی ۔ افسوس ہے کہ اس وقت اس فقرہ کے بارے میں مزید معلومات حاصل نہ کرسکا ، اس لئے اس

کے علاقے اور زمانے کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا) ۔

ضلع امرتسر کی تحصیل پٹی میں جین مذہب کے ایک مندر سے سدھ ناتھ جوگیوں کے فرقے کی زبان میں ایک قدیمی تحریر دستیاب ہوئی ہے ۔ اس زبان کو ماہرین نے اپ بھرنش سے تعبیر کیا ہے اور اسے گیارہویں صدی عیسوی کے لگ بھگ کے زمانے کی زبان بتلایا ہے ۔ اس تحریر میں ان حروف ربط کا استعمال موجود ہے ۔ جیسے کہ:

سس گھر سور سمانے بھانی
ہر درسن کی سوجھی پانی

(چاند کے گھر سورج آیا ،
حلوہ حق کی حقیقت ظاہر ہوئی)

ملک محمد جائسی (۱۳۸۰ء تا ۱۵۳۸ء) نے پدماوت میں بھی ان حروف ربط کو استعمال کیا ہے :۔

آئی سرد رتو ادھک پیاری
تو کوار کاتک اجیاری
ایہو رتو کنت پاس جیہہ
سکھ تن کے ہیا مانہ
دھن ہنس لاگے پیا گلے
دھن گل پیا کے بانہ

سردیوں کا بہت ہی پیارا موسم آگیا
کاتک کی چاندنی رات ہے ۔
اس موسم میں جو محبوب کے پاس ہے
اس کے دل میں آرام ہے ۔
مبارک ہیں وہ جو ہنس ہنس کر محبوب کے گلے لگ رہی ہیں ۔
مبارک ہیں وہ جو محبوب کی گردن میں بازو حمائل کئے ہوئے ہیں ۔

فریدا ! پنکھ پرا ہونی ، دنی سہاوا باغ
نوبت وجی صبح سے چلن کا کر کاج

(اے فرید ! یہ دنیا ایک سہانا باغ ہے اور پرندہ یعنی انسان ایک مہمان ہے ۔
صبح سے ہی کوچ کا نقارہ بج رہا ہے تو بھی سفر کا سامان کر ۔

کاگا نین نکاس دوں اور پی کے رکھ لے جائے
پہلے درس دکھائے کے تو پاچھے لیجئے کھائے

اے کوے ! میں اپنی آنکھیں نکال دیتی ہوں اور انہیں میرے محبوب کے رخ یعنی طرف لے جا ۔
پہلے انہیں محبوب کا جلوہ دکھا دینا اور بعد میں کھا لینا)

(شیخ فرید ۱۱۷۳ء تا ۱۲۶۵ء)

ذیل کی مثالیں بھی قابل غور ہیں :

سبھناں جئیاں کا اکو داتا
سو میں وسر نہ جائے
گر بن گھور اندھار
ست گر کہ جن جانیا
ست گر تس کا ناؤں
تم ہر کے نام کی تم پرچھاؤں

(گرونانک ۱۴۶۹ء تا ۱۵۳۸ء)

ست گر کے پرتاپ تو مٹ گئیو سب دکھ دند
کہے کبیر دبدھا مٹی ، گر ملیا راما نند

کبیر رنج گھر پریم کا مارگ اگم اگادھ
سیس آتار پگ تلے دھرے، تب نکٹے پریم کا سواد
[بھگت کبیر (قریباً ۱۴۲۵ء تا ۱۵۱۸ء)
گرو نانک کا ہم عصر]

ایہڑ تہڑ چھڈ توں، گُر کا شبد پچھا نو
ست گُراگے ڈھے پئیو، سب کچھ جانے جانو
آسا منساں جلائے توں، ہوئے رہو مہانو
ست گرکے بھانے بھی چلیے، تاں درگاہ پاوے مانو

(ادھر ادھر کی باتیں چھوڑو، مرشد کا قول پہچانو۔ خدا کے آگے سجدہ ریز ہوجاؤ وہ سب کچھ جاننے والا ہے۔ دنیا میں ایسے رہو جیسے کوئی مہمان رہتا ہے۔ رضائے الٰہی کے مطابق چلو تاکہ اس کی بارگاہ میں عزت نصیب ہو۔)

[گرو امر داس (۱۵۵۲ء تا ۱۵۷۴ء) عہد اکبر میں سکھ پنتھ کا تیسرا گرو]

آگیا بھئی اکال (۱) کی، تبھی چلائیو پنتھ
سب سکھن کر حکم ہے، گر مانیو گرنتھ (۲)
گرر گرنتھ جی مانیو، پرگٹ (۳) گراں کی دیہہ (۴)
جو پربھو کو ملبو چہے، کھوج شبد میں لیے

[گرو گوبند سنگھ (۱۶۷۵ء تا ۱۷۰۸ء)
عہد اورنگ زیب میں سکھ پنتھ کے آخری گرو]

"ٹک بوجھ من میں کون ہے، سب دیکھ آواگون ہے
من اور ہے تن اور ہے، من کا وسیلہ پون ہے
بندہ بنایا چاپ کوں، توں کیوں لبھانا پاپ کوں"

"جس نگری لہا کر جس ناہیں،
سو کاکر (۵) کوکر (۶) بستی ہے
اگر چندن کی سار نہ جانے،
پاتھر سینی گھستی ہے"

[شاہ حسین لاہوری ۱۵۳۸ء تا ۱۵۹۹ء]

"آؤ فقیرو میلے چلیے عارف کا سن واجا رے
اَنحد سبد سنو بہو رنگی تجئیے بھیکھ (۷) پیا جارے"

"دکھ جگ کے موہے پوچھن آئے
جن کے پیا پردیس سدھائے"

(بلّھے شاہ قصوری ۱۶۸۰ء تا ۱۷۵۸-۹ء)

سنت اندر سنگھ چکر ورتی کو گرر مکھی حروف میں ایک قلمی نسخہ دستیاب ہوا ہے جو کہ پندرھویں یا سولھویں صدی عیسوی کی تحریر معلوم ہوتی ہے۔ اس کے مصنف کا نام درج نہیں۔ ویسے تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ملتان کے علاقے کا رہنے والا تھا۔ اس تحریر میں بھی زیر بحث حروف ربط استعمال ہوئے ہیں، جیسے کہ:۔

"ایمنہ کے آدر نہاہ جنمنا عبداللہ پاتشا ھجادے کی پیٹھ تے آپجن مدینہ عرب ولایت محمد مصطفیٰ آوے گا۔ اپنا دین امر چلاوے گا ۔ کلی کا جگ اتھر بن بید محمدا امر لکھ درگاہ ملے گا محمد مصطفیٰ کلی میں آوتا ہے، بید اتھر بن آگے کی خبر دینا ہے۔"

تاریخی لحاظ سے سب سے پہلے جس متعلقہ زبان میں حرف ربط کے لئے 'کا' سے مشابہت رکھنے والا لفظ ملتا ہے وہ یونانی زبان ہے۔ یونانی

(۱) ازل سے ابد تک (۲) سکھوں کی مذہبی کتاب (۳) ظاہر (۴) جسم (۵) کوے (۶) کتے (۷) بھوک پیاس

لاحقہ 'اکا' [IKOS] یا 'اکا' [AKOS] بمعنی متعلقہ، جیسے کہ ہومریکا [HOMERIKOS] یعنی ہومر سے تعلق رکھنے والا۔ اسی طرح انڈیکا [INDIKOS] ہند سے تعلق رکھنے والا (نیل کا یونانی نام)، کوہ ہندو کش کا نام بھی یونانی زبان کی گواہی دیتا ہے۔ محققین کے نزدیک پہلے یہ یونانی زبان کا انڈیکوس یعنی کوہ ہند تھا لیکن بعد میں بگڑ کر ہندو کش بن گیا۔

مہا راجہ اشوک کے کتبوں اور بعض قدیم ڈراموں میں 'یونکا' اور 'رومکا' کے الفاظ میں بھی اس اضافت نسبتی کا ثبوت ملتا ہے۔ یہ الفاظ اس وقت کے مقامی یونانیوں میں مروجہ تلفظ کی ترجمانی کرتے ہیں یعنی روماٹیکا [ROMAIKA] روم سے تعلق رکھنے والا اور "ایونیکا [IONIKA] یونان سے تعلق رکھنے والا۔ مقامی یونانیوں سے ہی مقامی آبادی نے یہ الفاظ اور اس کے ساتھ ہی 'کا' کا نسبتی لاحقہ بھی اپنا لیا۔

بھی 'کا'، 'کے'، 'کی' کے حروف ربط پنجاب میں بطور صفات نسبتی بھی مستعمل ہیں، جیسے کہ: میکے (ماں کا گاؤں)، پیکے (باپ کا گاؤں) اسی طرح نانکے، داد کے وغیرہ۔

پنجاب کے دیہاتوں کے اکثر نام بھی انہی صفات نسبتی کی نشاندھی کرتے ہیں، جیسے کہ: فاضلکا، امروکا، مرید کے، کامونکے، سلیمانکی اور پتو کی وغیرہ۔ یاد رہے کہ اس طرز پر شہروں یا دیہاتوں کے نام عام طور پر سوائے پنجاب کے برصغیر کے کسی اور حصے میں نہیں ملتے۔

ان حروف ربط اور ان سے مشتق صفات نسبتی کے سرزمین پنجاب میں اتنے قدیم اور ھمہ گیر استعمال سے ثابت ہوتا ہے کہ برصغیر میں سب سے پہلے اسی سرزمین میں یونانی لسانیاتی اثرات کے تحت ان حروف کی داغ بیل پڑی اور یہیں سے اس کا بیج انقلابات کے بگولوں کے دوش پر سوار ہوکر برصغیر کے دوسرے حصوں میں بکھر گیا۔ جب نئی سرزمین میں اس کی کونپلیں پھوٹ آئیں تو یہ باور کرلیا گیا کہ یہ اس نئی سرزمین کی ہی پیداوار ہے۔

ایک اور صفت نسبتی بھی اسی ہندو یونانی عہد کی یادگار ہے۔ وہ ہے یونانی 'آنہ' [ANA] کا لاحقہ بمعنی تعلق رکھنے والا۔ اس کا ثبوت ہمیں قدیم شہروں کے یونانی ناموں سے ملتا ہے، جیسے کہ باختریانہ (باختر کا ملک)، اسی طرح سوگدیانہ، سوسیانہ، ایکبتانہ، وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرز پر پنجاب کے کئی ایک شہروں اور دیہاتوں کے نام ملتے ہیں، جیسے کہ مگھیانہ (مگھ قوم کا شہر)، لدھیانہ، گولیانہ، گونیانہ، بگیانہ، لنکیانہ اور واندرجٹانہ وغیرہ وغیرہ بلکہ پنجاب کے ضلع گجرات میں تو باورچی خانہ کو بھی چولھے کی نسبت سے اسی طرز پر چولہانہ کہتے ہیں۔ گو اردو میں بھی اس صفت نسبتی کا استعمال عام ہے، جیسے راجپوتانہ، تلنگانہ، ہندوانہ وغیرہ۔ اغلب یہی ہے کہ اہل یونان سے پہلے یہ 'آنہ' کی صفت نسبتی اہل پنجاب نے مستعار لی اور یہاں یہ سے اردو زبان میں سرائت کر گئی۔ فارسی زبان میں بھی اس صفت نسبتی کی ایک آدہ مثال مل جاتی ہے، جیسے کہ مردانہ، زنانہ وغیرہ۔ لیکن انہیں ایک حد تک استثنائی حیثیت حاصل

ہے اور وہاں بھی یہ صفت نسبتی خاندان سیلوکس کے عہد کی یادگار معلوم ہوتی ہے ۔ خاص طور پر ایران میں فی زمانہ کسی شہر یا گاؤں کا نام اس طرز پر موجود نہیں کہ جس کی نقل میں برصغیر میں اس قسم کے نام تراشے جاسکتے ۔

اب ہم تانیث کے علامتی لاحقہ ' ن ' کو لیتے ہیں جو کہ اردو اور پنجابی گرامر میں یکساں مذکر سے مونث بنانے کے لئے استعمال ہوتا ہے ۔

سنسکرت میں مذکر سے مونث بنانے کے لئے کوئی قاعدہ کلیہ موجود نہیں، صرف چند ایک ایسے علامتی لاحقے موجود ہیں جن کی بنا پر بعض اوقات مذکر اور مونث کو ایک دوسرے سے متمیز کیا جا سکتا ہے ۔ بعض اوقات تو تذکیرو تانیث کا جنس کے ساتھ بھی کوئی تعلق نہیں ہوتا ۔ سینا (فوج) جو کہ صرف مردوں پر مشتمل ہوتی ہے محض آخری ' ا ' کی بنا پر جو کہ سنسکرت میں عام طور پر تانیث کی علامت ہے ، مونث کہلاتی ہے ۔ پنگھٹ جہاں صرف عورتوں کا جمگھٹ ہوتا ہے مذکر شمار کیا جاتا ہے ۔ اسی طرح ایک ہی چیز کا نام مذکر ، مونث اور لاجنس بھی ہو سکتا ہے ، جیسے کہ کنارے کے لئے تٹ ،مذکر ، تٹی مونث اور تٹمو لاجنس ہے ۔ یہاں تک کہ موقع ، محل کے مطابق بیوی کے لئے بھی ' دار ' (مذکر) ' کلتر ' (لاجنس) اور ' جایا ' (مونث) میں سے کوئی بھی لفظ استعمال ہو سکتا ہے ۔ واؤ کا لاحقہ ، مذکر مونث اور لاجنس تینوں حالتوں میں مستعمل ہوتا ہے ، جیسے کہ ششو (لڑکا) ، سیتو (پل) اور مدھو (بہار) مذکر ہیں ، لیکن مدھو (جب شہد کے معنوں میں مستعمل ہو)، دھینو (گائے) اور وسو (دولت) مونث ہیں اور تنو (جسم) لاجنس ہے ۔

سنسکرت میں مندرجہ ذیل لاحقے زیادہ تر تانیث کی علامت شمار کئے جاتے ہیں :

آ : پرتیبھا (خیال) ، پرتیما (عکس) ، جنتا (عوام) ، میدھا (یادداشت)

او : دھینو (گائے) ، مدھو (شہد) ، چنچو (چونچ) ، رجو (رسی) ۔

آو : ودھو (بہو ، بیوی) ۔

ای : رجنی (رات) ، دیوی (ملکہ) ، وانی (آواز) ، ترنی (جہاز) ۔

گو ایک آدھ مثال ' نی ' کے تانیثی لاحقے کی بھی ملتی ہے جیسے کہ آرنیہ بمعنی جنگل سے آرنیانی بمعنی جنگل کی دیوی اور ' اندرا ' سے ' اندرانی ' ، اگرچہ اندر کا مونث اندرا بمعنی لکشمی دیوی تسلیم کیا جاتا ہے ۔ ان دو مثالوں کے علاوہ قدیم سنسکرت میں تانیث کے لئے ' نی ' کا "لاحقہ شاذ ہی نظر آتا ہے ۔ پراکرت میں تو یہ لاحقہ قریب قریب متروک ہے ۔ موجودہ پتنی بمعنی بیوی اور پترنی بمعنی لڑکی کو سنسکرت کی بجائے ہندی کہنا زیادہ موزوں ہوگا ۔ کیونکہ بیوی کے لئے قدیم سنسکرت میں عام طور پر جایا ، دار ، کلتر اور ودھو کے الفاظ ملتے ہیں ۔ اسی طرح پتر کی مونث بجائے پترنی کے پتریکا تسلیم کی جاتی ہے ۔ ویسے سنسکرت میں بیٹی کے لئے دوھتو ، آتمجا ، ستا اور تنیا کے الفاظ مستعمل تھے ۔ بہرحال سنسکرت

میں سوائے مندرجہ بالا مستثنیات کے 'ن' کا لاحقہ کہیں مستعمل نہیں ہوا۔

فارسی صرف ونحو میں بھی کوئی ایسا مسلمہ لاحقہ نظر نہیں آتا جس سے تذکیر و تانیث کا پتہ چل سکے۔ کچھ اسماء تو ایسے ہیں کہ جن کی صنف خود اُن کے نام سے ہی ظاہر ہے جیسے کہ مادر، پدر، دیو، پری، اسپ، مادیاں۔ باقی اسما کے لئے تذکیرو تانیث کا طریقہ یہ ہے کہ انسانی صنف کے لئے مرد و زن کا لاحقہ زیادہ کرتے ہیں، جیسے کہ پیر مرد، پیر زن، جادوگر مرد، جادوگر زن، جانوروں کے لئے نر اور مادہ کا لفظ زیادہ کرتے ہیں، جیسے کہ گربۂ نر، گربۂ مادہ، شیر نر اور شیر مادہ وغیرہ۔

غرضکہ یہاں بھی تانیث کے لئے 'ن' کا لاحقہ مستعمل نہیں۔ یونانی تانیث کے لئے ،ن، کا لاحقہ زمانۂ قدیم سے مستعمل ہے اور اس کا استعمال عام ہے جیسے کہ:۔ مذکر

هیلئس (HELIOS) بمعی روشن
کاتھرو (KATHAROS) بمعی پاکیزہ، پاکباز
ھرمیس (HERMES) ایک یونانی دیوتا کا نام
ہیرو (HEROS) مافوق الفطرت صفات کا حامل انسان
الیگزینڈر (ALEXANDER) انسانوں کا محافظ

مونث

ہیلن (HELEN) کیتھرائن (KATHARINE)
ہرمائن (HERMIONE) ہیروئن (HEROINE)
الیگزینڈرینا (ALEXANDRĒNĀ)

اسی نہج پر پنجابی اور اردو گرامر میں 'ن' کا لاحقہ تانیث کے لئے عام استعمال میں آتا ہے، جیسے کہ:۔

مذکر	مونث	مذکر	مونث
مالی	مالن	دلہا	دلہن
دھوبی	دھوبن	پنجابی	پنجابن
جوگی	جوگن	ہندوستانی	ہندوستانن
		لاہوری	لاہورن

اغلب یہی ہے کہ اردو اور پنجابی زبانوں میں تانیث کے لئے 'ن' کا لاحقہ براہ راست یونانی زبان سے ہی وارد ہوا یعنی ہندو یونانی عہد میں یہ لاحقہ پنجابی زبان میں داخل ہوا اور یہاں سے آگے اردو میں ودیعت ہوگیا۔

اس مضمون کی تیاری میں زیادہ تر مندرجۂ ذیل کتابوں اور مضامین سے استفادہ کیا گیا ہے۔

1. The Loom of Language
by Frederick Bodmer
2. The Words and their ways in English Speech
by J B. Greenough and G. L. Kittredge
3. Concise Etymological Dictionary of the English Language
by W. W. Skeat
4. اردو زبان کا ارتقا
از ڈاکٹر شوکت سبز واری
5. Greek Pronunciation of Hindu Words
by A. Weber (Berlin), in the Indian Antiquary, May, 1873.

پنجابی زبان کے مختلف عہد کے نمونوں کے لئے میں زیادہ تر ماہنامہ 'پنجابی دنیا' (بحروف گورمکھی) پٹیالہ اور 'بھارتی پنجاب' کی مختلف اشاعتوں کا مرہون ہوں جو کہ مجھے ڈاکٹر جیت سنگھ سیتل، ایم۔اے، پی ایچ۔ڈی، ڈائرکٹر شعبۂ پنجابی، محکمۂ لسانیات (بھارتی پنجاب) کی وساطت سے موصول ہوئیں۔ نیز دیکھئے "وادیٔ سندھ کی تہذیب پر یونانی اثرات" از عین الحق فرید کوٹی مطبوعۂ امروز مورخہ ۱۵ فروری ۶۳ء

حروف کا تبادل

سہیل بخاری

قدیم و جدید زبانوں کے تقابلی مطالعے سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ بعض مشترک لفظ اگر ایک زبان میں ایک حرف سے لکھا ہوا ہے تو دوسری زبان میں دوسرے حرف سے تحریر کیا گیا ہے، بلکہ کبھی کبھی تو ایک لفظ کی دو مکتوبی شکلیں ایک ہی زبان میں مل جاتی ہیں مثلاً اربھک (چھوٹا) اور اربھگ کہ ویدک زبان میں کہیں کاف سے لکھا ہوا ملتا ہے اور کہیں گاف سے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ کاف اور گاف دونوں ایک دوسرے کی جگہ لیتے رہتے ہیں۔ اس صورت حال کو تقابلی لسانیات میں تبادل حرف کا نام دے کر ایک مہتم بالشان اصول کے طور پر پیش کیا گیا ہے جس کی توجیہ و تشریح اس مقام پر دلچسپی سے خالی نہ ہوگی۔

ہندوستانی لسانیات میں زمانۂ قدیم کے گرامر نویسوں سے لے کر آج کے گرامر نویسوں اور محققوں تک نے بالاتفاق رائے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ ہماری موجودہ زبانیں اور ان کی مائیں جو پراکرتوں کے نام سے موسوم تھیں، سنسکرت سے مشتق ہیں۔ پراکرت کے گرامر نویس یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ پراکرتیں براہ راست سنسکرت سے نکلی ہیں لیکن بعض محتاط مستشرقین کا خیال ہے کہ وہ سنسکرت کی کسی ملتی جلتی بولی سے پیدا ہوئی ہیں۔ اسی طرح بعض محققین کہتے ہیں کہ موجودہ زبانیں براہ راست سنسکرت سے ماخوذ ہیں اور کچھ کا موقف یہ ہے کہ وہ سنسکرت سے بواسطۂ پراکرت مشتق ہوئی ہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں جو سنسکرت کو موجودہ زبانوں کا ادبی روپ قرار دیتے ہیں۔ ان تمام آرا میں اختلافات کے باوجود سب سے بڑی قدر مشترک یہ ہے کہ موجودہ زبانیں ہوں یا پراکرتیں ان سب کا سلسلۂ نسب سنسکرت پر جا کر منتہی ہوتا ہے۔ دوسری طرف مستشرقین سنسکرت کو ویدک کی ترقی یافتہ شکل کہتے ہیں اور ویدک کو قدیم ہند یورپی زبان کی شاخ بتاتے ہیں۔ یوں اس برصغیر کی تمام قدیم و جدید زبانیں بواسطہ سنسکرت و ویدک قدیم ہند یورپی زبان کی اولادیں ٹھہرتی ہیں۔

اندریں حالات تبادل حروف کی تشریح میں یہ لازم ہے کہ میں زبانوں کے اس نام نہاد کثیر العیال خاندان (ہند یورپی) کی قریب قریب ہر اہم شاخ سے حوالے پیش کروں اور جہاں جہاں اختلافات

نظر آئیں ان کی تشریح کرتا چلوں تا کہ اس لسانی گروہ بندی کا آریائی نقطۂ نظر سب پر واضح ہو جائے کہ مستشرقین ، ایرانی علما اور ہندوستانی آچاریہ میں سے بعض اپنے آریائی ذہن کے باعث ایسا سوچنے پر مجبور ہیں ، بعض محض کسی آریائی زبان سے شدید جذباتی وابستگی کے سبب اس خیال کے مؤید ہیں اور کچھ کثرت آرا سے متاثر ہوکر ان کے شریک ہو گئے ہیں اور خود انہوں نے تحقیق کی کوئی کوشش نہیں کی ہے۔

اب آپ اس تبادل پر غور کیجئے جس کی ایک قسم حلقی وحنکی حروف کا تبادل ہے یعنی بعض زبانوں میں حلقی حروف (کاف اور گاف) حنکی حروف (چ اور ج) سے جگہ بدل لیتے ہیں مثلاً ویدک شوک (شعلہ) سے شوچتی (وہ چمکتا ہے)۔ ویدک یوگ (جوا رکھنا، جوتنا) اور یجے (میں جوا رکھتا ہوں ، میں جوتتا ہوں) . یونانی اگروس (کھیت)= ویدک اجرہ، یونانی اٰءکسو= لاطینی اٰءگسے= ویدک اوجس (طاقت) . اوسنا چستی (وہ آتا ہے)= ویدک گچھتی، ویدک سنچتی (وہ خالی کرتا ہے) اور ویدک سکت (خالی کیا ہوا) . اوستاسوک (سوئی) = پہلوی سوچن . فارسی آخشیج = آخشیگ وغیرہ لیکن اس قسم کا رجحان اس برصغیر کی موجودہ زبانوں میں نظر نہیں آتا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ تبادل پراکرتوں کے لئے غیر تھا لیکن اس تبادل کی مثال میں ور روچی سوتر ۲-۳۳ میں اور لکشمی دھر سوتر ۱-۳-۱۳ میں صرف ایک لفظ کراتو چلادو پیش کرتا ہے جو ایک مفروضہ ووپ معلوم ہوتا ہے کیوں کہ کتابی پراکرت ایک مصنوعی زبان ہے جس کے صدہا مفروضہ روپ سنسکرت سے انہی اصولوں کے مطابق ڈھال لئے گئے ہیں جو سنسکرت اور قدیم ہند یورپی زبان سے مخصوص ہیں۔ دوسری طرف اگر 'چلادو، کو ایک حقیقی روپ بھی تسلیم کرلیا جائے تب بھی پراکرت میں اس تبادل کو ثابت کرنے کے لئے یہ تنہا روپ کافی نہیں ہوسکتا .

اس تبادل پر تمام محققین کا اتفاق ہے لیکن اس کی توجیہ بہت کم لوگوں نے کی ہے۔ جان بیمز اپنی کتاب ”جدید آریائی زبانوں کی تقابلی گرامر“ (مطبوعہ لندن ۱۸۷۲ء) کی جلد اول کے صفحہ ۷۲ پر کہتا ہے کہ قدیم آریائی (ویدک ، سنسکرت اور کتابی پراکرت) یونانی اور لاطینی کے علاوہ سامی زبانوں میں بھی جن کی آوازیں (چ اور ج) نہیں ہوتی تھیں. اس کے نزدیک حلقی آوازیں (ک، گ) ان سے قدیم تر اور ابتدائی ہیں جن سے بعد میں حنکی آوازیں پیدا ہوئی ہیں لیکن ایک قسم کی آوازوں سے دوسری قسم کی آوازیں پیدا ہونے کی بات گلے نہیں اترتی کیونکہ بیمز کے اس قسم کے اور بھی نظریات غیر منطقی مفروضے ہیں۔ البتہ جوزف وائٹ نے ” یونانی زبان کی تقابلی گرامر (مطبوعہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس ۱۹۱۲ء) میں ہند یورپی زبان کے حروف تہجی کا نقشہ دے کر تشریح کی ہے کہ اس زبان کی قدیم لپی میں حلقی اور حنکی دونوں قسم کی آوازوں کے لئے صرف ایک ہی قسم کے حروف ملتے تھے . اس طرح

حلقی اور حنکی حروف کے تبادل میں اس کے خیال کے بموجب ہند یورپی زبان کی ابتدائی لپی کا ہاتھ رہا ہے اور یہی بات قرین صحت معلوم ہوتی ہے۔

دوسرا تبادل مصیت وغیر مصیت حروف کا ہے یعنی ک ، گ ــ ، چ ، ـ ج ـ ت ، د اور پ ، ب ، باہم جگہ بدل لیتے ہیں اور یہ بھی خالص ہند یورپی زبان کی خصوصیت ہے جو اس کی مختلف شاخوں یونانی، اوستائی اور فارسیٔ قدیم کے علاوہ ویدک میں بھی ملتی ہے۔ چنانچہ ہڈسن ولیم نے اپنی کتاب "تقابلی گرامر کا ایک مختصر تعارف" (مطبوعہ کارڈف ۱۹۳۵ ء) میں ہند یورپی کے الپ پرانوں کا جو نقشہ دیا ہے اس میں ہند یورپی ب ، د، گ کو گاتھک زبان کے پ، ت ، ک کا متبادل ٹھہرایا ہے۔ جوزف رائٹ نے اپنی کتاب کے صفحہ ۷۰ پر لکھا ہے کہ یونانی زبان میں مصیت وغیر مصیت حروف کا تبادل عام ہے بلکہ پارہ نمبر ۱۰۶ میں وہ یہ بھی کہتا ہے کہ قدیم ہند یورپی زبان کی مختلف شاخوں میں تقسیم ہوجانے سے قبل ہی اس میں گ ، د ، ب کی آوازیں ک، ت، پ ہوچکی تھیں. جیکسن نے اوستا گرامر میں اوستا اور ویدک کا موازنہ کرتے ہوئے یہی بات اوستا کے لئے کہی ہے اور میکڈانل نے بھی ویدک گرامر میں ویدک زبان کی یہی خصوصیت بیان کی ہے. صاحب فرہنگ جہانگیری نے آئین ششم میں اس تبادل کو پیش کیا ہے اور انسائیکلوپیڈیا برٹانکا کی جلد نمبر ۲۱ میں حروف تہجی کے تحت بھی لکھا ہوا ہے کہ فارسیٔ جدید میں فارسیٔ قدیم سے جو اختلاف ہوا ہے اس میں ک ، ت ، پ ، چ ، کا ، گ ، د ، ب ، ز سے تبادل خاص ہے.

اس تبادل کی چند مثالیں ملاحظہ کیجئے :

ویدک ا. بھک (چھوٹا) = اربھگ، کلپھ (ٹخنہ) = گلپھ ، تج (بچہ) = تج ، چنٹ (کاٹنا) = چنڈ ، تاوت (تب تک) = تاود ، یاوت (جب تک) = یاود ، اپ جا (آب زاد) = اب جا - اوستا کت (گھر) = پہلوی کتک = فارسی جدید کد ، کدہ ، اوستا ھچ = فارسی قدیم ھچا = پہلوی اج = فارسی جدید (ز ز)، اوستا کرت (چھری) پہلوی کارت = فارسی جدید کارد، فارسی تنبورہ، دبنورہ، ستایش = سیدایش، دراج = تراج ، گفتید گفتیت کردید = کرتیت ، زردشت = زرتشت ، کاج = کاچ ، پہلوی چوپ (مکڑی) = فارسی جدید چوب = ویدک آپ = اوستا آپ = فارسی جدید آب، سنسکرت لوپاش = پہلوی روپاس ، روباس = فارسی جدید روباہ سنسکرت شوک = فارسی جدید سوگ ، ویدک یکو = اوستا یاکر = پہلوی جکر = فارسی جدید جگر، ویدک وات = اوستاوات (ہوا) فارسی جدید باد، ویدک کپوت = پہلوی کپوث کبوت = فارسی جدید کبوتر ، ویدک کشب = فارسی جدید شب وغیرھا .

یہ تبادل پراکرت زبان کے لئے غیر ہے لیکن گرامر نویسوں نے اس کو بھی پراکرت میں تلاش کرنا چاہا ہے اور اس کی کچھ مثالیں پیش کی ہیں۔ مثلاً سنسکرت ایکو یا ایکم = پراکرت ایگو یا ایگم (چنڈ ۳-۱۲، لکشمی دھر ۱-۳-۱۴)۔ ایگ کا لفظ

آج کل کی زبانوں میں نہیں ملتا اور یہ ثبوت اس بات کا ہے کہ یہ روپ فرضی ہے۔ البتہ بعض لوگ ایگیارہ (گیارہ) کو بھی اس تبادل کی مثال میں پیش کرتے ہیں کہ گنتی کی ہر دھائی ایک سے شروع ہوتی ہے، اس لئے ایگیا بھی ایک یا اکیا کا بدل ہوگا، لیکن اس لفظ کی حقیقت کے متعلق اس وقت یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ لکشمی دھر سوترا ۔۱۲۔۳ میں ایک اور لفظ لوک=لوگ بھی دیتا ہے لیکن اس جوڑے میں معنوی اختلاف ملتا ہے. سنسکرت میں لوک کے معنی دنیا کے ہیں اور پراکرت میں لوگ کے معنی مرد کے ہیں جس کا اسم مونث لگائی عام طور پر ہماری زبانوں میں مستعمل ہے۔ پنجابی میں لفظ "لوک" سنسکرت کے زیر اثر 'لوگ' ہی سے بنایا گیا ہے۔ چند سوتر ۳۔۱۲ میں پشاچی کا بدل پساجی اور 'کرت' کا بدل 'کد' دیتا ہے. یہ بھی فرضی روپ ہیں. پشاج کے اصل تلفظ کا تو مجھے اس وقت علم نہیں البتہ سنسکرت اور ویدک کا "کرت" پراکرت 'کل اور کر' کا بدل ہے۔

محققین اس تبادل کی کوئی توجیہ نہیں کرتے البتہ اس سلسلے میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ قدیم ہند یورپی زبان کا تلفظ کچھ اس قسم کا تھا جس میں دوآوازیں ایک ساتھ ادا کی جاتی تھیں. اس کا اندازہ پنجابی زبان کے تلفظ سے لگایا جاسکتا ہے جس پر آریائی زبان کا زیادہ اثر پڑا ہے۔ چنانچہ اس میں بھرا، پھرا اور ٹول، ڈول وغیرہ کا تلفظ ایک ہی سا ہوتا ہے اور دوسری معاصر زبانوں کے حالیہ تمام کی ت بھی د سے بدل گئی ہے مثلاً کرتا = کردا، چلتا = چلدا وغیرھا. اسی آریائی تلفظ کے باعث ہند یورپی زبانوں میں ایک لفظ ایک مقام پر مصیت سے لکھا ہوا ملتا ہے تو دوسرے مقام پر غیر مصیت سے۔

تیسرا تبادل دندانی اور مخی حروف کا ہے یعنی ت اور د بالترتیب ٹ اور ڈ سے بدل جاتے ہیں لیکن یہ بات صرف ویدک اور لاطینی سے مخصوص ہے کیونکہ لاطینی میں ٹ، ڈ مقامی اثرات ہیں اور ویدک میں ٹ، ڈ، خالص ہندوستانی آوازیں ہیں جن سے یونانی اور اوستائی وغیرہ خالی ہیں. اس تبادل کو پراکرت کے گرامر نویسوں نے بڑے زور شور سے پیش کیا ہے، مثلاً ستسکرت ترسر = پراکرت ٹسر، (لکشمی دھر ۱۔۳۔۳۷)، سنسکرت دولا = پراکرت ڈولا، سنسکرت دنڈ = پراکرت ڈنڈ (لکشمی دھر ۱۔۲۔۳۵، ورروچی ۲۔۳۵)، سنسکرت در= پراکرت ڈر (ھیم چندر ۱۔۲۱۷) وغیرہ یعنی ان کے نزدیک سنسکرت کے الفاظ دندانی حروف پراکرت میں مخی حروف سے بدل لئے گئے ہیں حالانکہ حقیقت بالکل اس کے برعکس ہے۔

بعض بعض محققین ہندوستان کی ان مخصوص آوازوں کو بھی ہند یورپی کی آوازوں سے مشتق ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ جان بیمز حسب دستور سابق اپنی کتاب کے ص۷۳ پر لکھتا ہے کہ ڈ اوستائی د + رکی اور ٹ اوستائی ت + رکی سی آواز دیتا ہے مثلاً ویدک چندر = پراکرات چنڈ (چاند) اور ویدک پتر = پراکرت پٹ (بیٹا)۔ وہ کہتا ہے کہ اب آکر ان کا ابتدائی تلفظ بدل گیا ہے اور انھوں نے موجودہ آوازیں اختیار کرلی ہیں جو

قدیم آوازوں کی جگہ استعمال ہورہی ہیں ۔ اس کے باوجود کثرت رائے اسی امر پر ہے کہ یہ آوازیں ہندوستانی ہیں اور قدیم ہندیورپی ان سے یکسر خالی تھی ۔

میکڈانل نے ویدک کے دندانی اور مخی حروف کے تبادل کی تشریح تو کرنا چاہی ہے کہ کن حالات کے تحت دندانی حرف مخی حروف سے بدل جاتا ہے لیکن اس کی وضاحت اس نے بھی نہیں کی کہ اس تبادل کا تعلق محض مکتوبی وروپوں سے ہے یا آوازوں سے۔ یہ میرے نزدیک اس تبادل کی تشریح و توجیہ یہ ہے کہ آریا جو قدیم ایرانی زبان بولتے ہوئے ہندوستان میں داخل ہوئے تھے ، ابتدا میں یہاں کی مخی آوازوں (ٹ، ڈ، ڑ) کا صحیح تلفظ نہیں کر پاتے تھے۔ جیسا کہ آج کل بھی ایک ایرانی کے لئے نا ممکن ہے ۔ دوسرے یہ کہ ان کی قدیم لپی میں بھی جو وہ اپنے ساتھ لائے تھے ، ان آوازوں کے لئے کوئی علامات (حروف) مقرر نہیں تھیں اس لئے انہوں نے ویدک میں ان آوازوں کو ان سے مشابہ یعنی اپنی آبائی زبان کی دندانی آوازوں (ت، د یا ت + راور د+ ر) سے ادا کیا اور ویدک میں اپنی لپی کے دندانی حروف سے تحریر بھی کردیا ۔ اس کا اثر پنجاب کی زبان پر زیادہ پڑا کیونکہ آریاؤں کی بود و باش ہندوستان کے اس علاقے میں دوسرے علاقوں کی بہ نسبت زیادہ عرصے تک رہی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ شورسینی پراکرات میں مہاراشٹری پراکرت کے اور پنجابی میں اردو کے مخی حروف کی جگہ بیشتر دندانی حروف ملتے ہیں، مثلاً اردو ڈھکیل = پنجابی دھکیل ، اردو ٹوٹ = پنجابی تٹ وغیرہ ۔

یہ ویدک کے اس تبادل کی جزوی تشریح ہے کیونکہ ویدک میں مخی حروف کے استعمال میں بھی بڑی ناہمواری ملتی ہے یعنی جہاں اس میں پراکرت کے مخی حرف کو دندانی سے بدل کر مونڈھ (سر) کو موردھانم ، اٹھا کو ورتھا ، بیٹھا کو ویدھا ، ڈول کو درون ، لٹایا کو نجاتیا ، انڈل (وہ جانور جو خصی نہ کیا گیا ہو) کو آنلٹ (بیل)، بٹ (بل) کو ورت ، ٹھنڈا کو شحندرا ، اکڑا کو اکرت ، باچھڑا (بچھڑا) کو باشرا، گھوڑا کو گھورم ، سونڈ کو شونر، اورسٹا (نزدیک) کو سچا لکھا گیا ہے، وہاں دندانی کو مخی سے بدل کر وشتی کو وشٹی (وہ چاھتا ہے)، فارسی است (ہے) کو اشٹ، اوستائی مرکب ست کوشٹ، یونانی لاحقہ تفضیل کل استوس کو اشٹھ ، ایرانی مرزد (صاف کیا ہوا) کو مرشٹ ، فارسی سرشت کو سرشٹی بھی تحریر کیا گیا ہے ۔

تبادل کی چوتھی قسم الپ پران (ک،گ، ج، چ وغیرہ) اور مہاپران (کھ، گھ، جھ، چھ وغیرہ) کے تبادل کی ہے اور یہ بھی صرف ویدک سے مخصوص ہے، کیونکہ قدیم ہند یورپی زبان میں مخی حروف کی طرح مہا پران بھی نہیں تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی اس کی شاخوں میں یہ حروف نہیں ملتے لیکن مسترقین ویدک کو تمام و کمال قدیم ہندیورپی زبان سے مشتق گردانتے اور اس کے مہا پرانوں کو بھی ہند یورپی کی ملکیت بتاتے ہیں، حالانکہ وہ اس بات کی توجیہ سے قاصر ہیں کہ آخر قدیم ہندیورپی کی دوسری شاخوں سے یہ آوازیں کیوں اور کیسے معدوم

ہو گئیں ۔ دراصل ان کو ویدک کے پراکرت جزو کا علم ہی نہیں ہے اور یہ حقیقت بھی ان کی نظر سے رہ گئی ہے کہ جو زبان ایک جگہ سے دوسری جگہ کو سفر کرتی ہے ، اس میں مقامی اثرات بھی داخل ہو جاتے ہیں ۔

میرے نزدیک اس تبادل کی توجیہ یہ ہے کہ آریوں کو ہندوستان میں آکر جب مخی آوازوں کی طرح مہاپرانوں سے بھی سابقہ پڑا تو انہوں نے ان کی جگہ اکثر محض الپ پران بول اور لکھ کر کام نکالا ۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ آج نہ صرف اردو بلکہ ہندوپاک کی تمام زبانوں کے کثیر تعداد الفاظ میں قدیم مہاپرانوں کی جگہ الپ پران نظر آتے ہیں (دیکھئے میرا مقالہ "قدیم مہا پران اردو میں" مطبوعہ اردو نامہ کراچی شمارہ ششم) ۔ لیکن یہاں بھی ویدک میں وہی بے ضابطگی نظر آتی ہے جو دندانی و مخی کے تبادل میں اوپر بیان ہو چکی ہے۔ چنانچہ جہاں اس میں مہاپرانوں کو الپ پرانوں سے تحریر کیا گیا ہے وہاں الپ پران بھی مہاپران سے لکھے گئے ہیں ۔ پہلے اول الذکر قسم کی مثالیں دیکھئے جن میں مہاپران الپ پران بن گئے ہیں ۔

پراکرت چڑھاؤ = ویدک چراؤ ، پراکرت بکھر (بکھرنا) = ویدک و کرت ، پراکرت پھول = ویدک پوت ، پراکرت بھپھ (بھاپ) = ویدک ورپس ، پراکرت پھاٹا (پھٹی ہوئی) = ویدک پراچا ، پراکرت انھ (برباد کرنا) = ویدک اشن ، پراکرت انھ (کھانا) = ویدک اشن ، پراکرت کنھ (کالا) = ویدک کرشن ، پراکرت لٹھی = ویدک رشٹی ، پراکرت چھنھ (جماع کرنا) = ششن پراکرت بھجن = ویدک ورجن ، پراکرت پھیپھڑا = ویدک پپرو ، پراکرت آکھیا = ویدک (پنجابی بمعنی کہا) = ویدک آسیا ، پراکرت راکھتے (رکھتے) = ویدک راستے ، پراکرت سمجھتے = ویدک سماستے ، پراکرت لکھ (پرونا ، گوندھنا) = ویدک نشک ، پراکرت بھکھ (بھکنا ، کھانا) = ویدک بھکش ، پراکرت سکھاتا (سکھاتا) = ویدک سورشاتا ، پراکرت آچھے (بنگالی بمعنی ہے) = ویدک آشیے ، پراکرت چھڑ (سلاخ) = ویدک شر ، پراکرت چھڑیاں = ویدک شریام ، پراکرت لکھ پتی = ویدک دکش پتی ، پراکرت چھو (راجستھانی بمعنی ہوجاؤ) = شو ، پراکرت چھاگ (بنگالی بمعنی بکری) = شاگو ، پراکرت چھریا (برج بھاشا بمعنی بکری) = شریا ، پراکرت جھٹ (چم) = ویدک شل ، پراکرت کھبا (پنجابی بمعنی بایاں) = ویدک سویا وغیرہ ۔

اب وہ مثالیں دیکھئے جن میں الپ پران مہا پران بن گئے ہیں:

فارسی ببر (شیر) ویدک بھبرو (بادامی) فارسی بغ = ویدک بھگ (بھگوان ، خدا) فارسی ، برگ (پتا) = ویدک بھرگ ، فارسی ابر (بادل) = ویدک ابھر ، فارسی درمان (چارہ) = ویدک دھرمن ، فارسی گردد (اڑھکتا ہے) = ویدک گردھد ، فارسی دادار = ویدک دادھار ، اوستا بوئتی (ہوتا ہے) = ویدک بھوتی ، اوستا مئدیم (درمیانی) = ویدک مدھیم فارسی بوم (زمین) = ویدک بھوم ، اوستا براتو = فارسی جدید برادر = ویدک بھراتر ، اوستا بندم = ویدک بندھم ، اوستا درگم (لمبا) = ویدک دیرگھم فارسی بیم (خوف) = ویدک بھیم ، یونانی ستیسس

(قیام) = ویدک ستھتی وغیرہ بلکہ یہ ناہمواری اور بے ضابطگی خود پراکرت الفاظ تک جا پہنچی ہے مثلاً پراکرت سگرو (برج بھاشا بمعنی تمام) = ویدک سگھنو ، پراکرت بیلا (برج بھاشا بمعنی وقت ، پنجابی ویلا) = ویدک وے دھا ، پراکرت باؤلے (پاگل) = ویدک واورد ہے = پراکرت بلاؤ ، ویدک ودھاؤ ، پراکرت بوجھا (سمجھا) = ویدک بھوشت وغیرہ۔

تبادل کی مندرجۂ بالا اہم قسموں کے علاوہ ی اور ج ، و اور ب ، س اور ہ کے جوڑے بھی خاص توجہ کے مستحق ہیں۔ ی اور ج کا تبادل ہند یورپی کی تمام شاخوں میں عام ہے اور اس کا سبب محض اصول کتابت کا اختلاف ہے۔ یعنی کہیں ی کے حرف سے ج کی اور کہیں ج کے حرف سے ی کی آواز مراد لی جاتی تھی بلکہ یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ چنانچہ ی کی آواز کے لئے بین الاقوامی اصول کتابت میں جے (J) کا حرف رکھا گیا ہے۔ اس کی مثالیں ملاحظ کیجئے۔ ویدک یکر = اوستا یاکر = پہلوی یکر، جکر = فارسی جدید جگر ، اوستا یخت (ملا ہوا) = پہلوی جخت = فارسی جدید جفت ، ویدک و اوستا یو = پہلوی یو ، جو = فارسی جدید جو اوستا اور ویدک یام = پہلوی یام ، جام = فارسی جدید جام ، ویدک یگیہ ، اوستا یسن = فارسی جدید جشن ، ویدک یا تودھان ، فارسی جادودان ، ویدک یوان = فارسی جوان ، ویدک اریمن ، فارسی ارجمند (عالی مراتبت) ویدک یگم (جوا) لاطینی جگم وغیرہ۔

پراکرت کے گرامر نویس بھی پراکرت میں اس تبادل کی نشان دہی کرتے ہیں حالانکہ 'ی'، ہندوستان سے باہر کا حرف تھا جو آریوں کے ساتھ قدیم و جدید زبانوں میں داخل ہوا ہے ، چنانچہ جاگیردار ڈاکٹر ورما کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ پرانی شاکھیہ میں ویدک کی ی کو بعض مخصوص حالات (مصرع کی ابتداء ، لفظ کی ابتداء ، حروف صحیحہ کے مرکب وغیرہ) میں ، ج کی طرح بولنے کی ہدایت ملتی ہے (انڈو ایرین لنگویجز ص ۹۳-۹۲ مطبوعہ پونا ۱۹۳۲ء)۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ویدک کے پراکرت جزو میں ج کو ی سے لکھا گیا ہے۔ مثلاً پراکرت جوگا (لائق) = ویدک یجیؤ ، پراکرت جدھ (جب) = یدھ ، پراکرت جا (جانا) = ویدک یا ، پراکرت گج پھاڑ (ہاتھیوں کو مار ڈالنے والا) ویدک گیس بھانو ، پراکرت جاکو (جس کو) = یاسو ، پراکرت جوجن (ایک مقررہ فاصلہ) = ویدک یوجن ، پراکرت جودھا (لڑاکا) = ویدک یودھا ، پراکرت ججھ ، جوجھ (لڑنا) = ویدک یدھ ، پراکرت جوتن (جوتنا) ویدک یوتن ، پراکرت سورج = ویدک سوریہ ، پراکرت کارج = ویدک کاریہ وغیرہ۔

ہند یورپی زبانوں میں و اور ب کا تبادل بھی کثیر الوقوع ہے مثلاً ویدک ور (پھل) = فارسی بر ، ویدک وجر (ہتھیار) = فارسی بزر ، ویدک وخشی = فارسی بخش (دے) ، ویدک وراٹ = فارسی برات ، ویدک وروتھ = فارسی باروت ، بارود ، فارسی خواب اور خواو ، تاب اور تاو ، بزرگ اور وزرگ ، بس اور وس ، نہیب اور نہیو ،

نیشتن اور نوشتن وغیرہ - پراکرت کے گرامر نویسوں نے سنسکرت کی تقلید میں اس تبادل کا سراغ بھی پراکرت کے فرضی روپوں میں لگا ڈالا (دیکھئے ہیم چندر ۱ - ۲۳۷) - حالانکہ ی کی طرح واو کی آواز بھی ہندوستان میں پہلی بار آریوں کے ساتھ داخل ہوئی ہے جس کا اثر تمام پراکرتوں پر پڑا ہے، بلکہ یہ اثر جدید زبانوں تک چلا آیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل کی زبانوں میں و اور ب کی قراواقعی تفریق نہیں ملتی - چنانچہ پنجابی میں ایک ہی لفظ کو کبھی واو سے بولتے ہیں کبھی ب سے - برج بھاشا میں ب بولنے کا رجحان زیادہ ہے - بنگالی اور اڑیا میں دونوں آوازوں کے لئے ایک ہی حرف ہے اور دیوناگری لپی میں بھی ایک حرف سے دوسرا حرف تراشا گیا ہے - غرض ویدک کے پراکرت جزو میں واو کی اصلیت صرف اتنی ہے کہ وہ پراکرت پیش یا ب یا بھ کا بدل ہوتا ہے یا پراکرت کے طویل حروف علت او یا آ کو ادا کرنے کے لئے بطور جزو استعمال ہوتا ہے، جیسے پراکرت بھجن = ویدک ورجن، پراکرت بھاگے بھاگے (الگ الگ) = ویدک واجے واجے، پراکرت بھن (بولنا - کہنا) = ویدک ورن، پراکرت بھنگ (منتشر) = ویدک وریج، پراکرت بلاؤ = ویدک ودھاؤ، پراکرت بکری = ویدک ورشنی، پراکرت بیلا (وقت) = ویدک وینا، پراکرت بدّل (بادل) = ویدک ورٹر، پراکرت جانن (جاون - جانا) = ویدک باون، پراکرت آترن (اترنا) = ویدک اوترن، پراکرت لاؤ (امر جمع حاضر) = ویدک

راسو، پراکرت سُر (آواز) = ویدک سون، پراکرت آٹھا = ویدک ورشچا، پراکرت اٹّھا = ویدک ورتھا وغیرہ -

ہند یورپی زبانوں میں س اور ہ کا تبادل بھی عام ہے - ہڈسن ولیم " تقابلی گرامر کے مطالعہ کا مختصر تعارف " کے ۳۲ پر کہتا ہے کہ قدیم ہندیورپی کا س، ایرانی، ارمنی، یونانی اور ویلش میں ہ سے بدل جاتا ہے مثلاً یونانی ہپت=ویدک سپت = لاطینی سپتم = اوستا ہپت = فارسی جدید ہفت، لاطینی سال = یونانی ہیلس = قدیم انگریزی سیلٹ = جدید انگریزی سالٹ (نمک) ویدک سدس = یونانی ہیدوس = لاطینی سے ڈس = انگریزی سیٹ (نشست)، ویدک دش = اوستا دس = فارسی جدید دہ، ویدک کسمائے (کس کو یا کس کے لئے) = اوستا کہمائے، ویدک سو، (اچھا) = اوستا ہو، ویدک شاس = فارسی شاہ، ویدک سونر = فارسی ہنر، ویدک سوم (شراب) = اوستا ہوم، ویدک سؤ سار (بہن) = فارسی خواہر، ویدک ماس (مہینہ) = فارسی ماہ، ویدک سینا (فوج) = اوستا ہئین، ویدک سنچتی (وہ خالی کرتا ہے) = اوستا ہنچتی، ویدک سروم (سب - کل) = اوستا ہئردم، ویدک آسی (توہے) = اوستا اہی، فارسی آماس = آماہ پہلوی روپاس، روجاس = فارسی جدید روباہ وغیرہ -

پراکرت کے گرامر نویس (لکشمی دھر

۱ ـ ۳ ـ ٦۱ ، ۱ ـ ۱ ـ ۳۹ اور هیم چندر ۱ ـ ۲۳۷ وغیرہ) جو اس تبادل کو پراکرت میں تلاش کرتے هیں، صرف ویدک و سنسکرت کی تقلید میں ایسا کرتے هیں کیونکہ ہ هندوستان سے باهر کی آواز هے جو واو اوری کی طرح پراکرت میں نہیں ملتی تھی۔ ان لوگوں نے اس تبادل کو پراکرت میں تلاش کرنے کے لئے نہایت غلط سلط سے فرضی روپ پیش کر دئے هیں ، مثلاً لکشمی دهر سوتر ۱ ـ ۳ ـ ۸۸ میں اوروررو چی سوتر ۲ ـ ۴۳ میں ویدک و سنسکرت دوس کا پراکرت روپ دہ ہو لکھتا هے حالانکہ سنسکرت لفظ کا صحیح تلفظ وهی هے جو یونانی زہ س (Zeus) کا هے اور جسے دہ هو کے تلفظ سے کوئی نسبت نہیں هے۔

اس بات کر سمجھنے کے لئے کہ پراکرتوں میں ہ کی آواز نہیں تھی، موجودہ زبانوں کا تقابلی مطالعہ مفید ثابت هوتا هے ان کے دوهرے تہرے روپ اس کے استعمال کی ناهمواری اور بے ضابطگی کی روشن دلیلیں هیں اور یہ ناهمواری اور بے ضابطگی بتاتی هے کہ ہ کی آواز باهر سے لا کر زبان میں داخل کی گئی هے۔ مثلاً اردو وہ = پنجابی آو ، اردو یہ = پنجابی اے ، اردو یہاں ، وهاں = یاں ، واں ، اردو دهی = بنگالی دوئی ، اودو بهی (بهی کھانا) = بنگالی بوئی (کتاب) ، اردو ، مرنہار = مرهٹی مرنار ، اردو هونہاو = مرهٹی هونار، اردو کلمہ تاکید ' هی ' = قدیم ای۔ چنانچہ اردو آپی = آپ + ای ، اردو کسی = کس + ای، اردو ابهی = ابھ + ای، اردو وهی = آو + ئی ، اردو یہی = اے + ای، اردو ایک = پنجابی هک ، اردو اور = پنجابی، هور وغیرہ۔ غرض ہ کے استعمال کی ناهمواری جاننے کے لئے ایک هی زبان میں یا دو زبانوں میں ایسے دوهرے روپ مل جائیں گے جن میں سے ایک میں ہ ملتی هے اور دوسرے میں نہیں۔ اس سے معلوم هوتا هے کہ ہ کا حشوی اندراج سب هی زبانوں میں هوا هے اور یہ بهی آریائی اثرات کا نتیجہ هے۔ مزید توثیق و تصدیق کے لئے گروگرنتھ صاحب کی گور مکھی کے وہ الفاظ دیکھے جاسکتے هیں جن میں حشوی ہ کا اندراج هوا هے لیکن دوسری قدیم تحریروں میں انهیں ہ کے بغیر لکھا گیا هے اور آج کی بول چال میں بهی ان کا تلفظ ہ سے خالی هے۔

هند یورپی زبانوں میں ان کے علاوہ کچھ اور بهی تبادل ملتے هیں جو خ، ز ، ژ، ش، ف، غ کے حروف سے متعلق هیں ۔ پراکرت تو خیر ان کی آوازوں هی سے خالی هے لیکن ویدک دیو ناگری لپی میں بهی ش کے سوا ان کے لئے کوئی حروف مخصوص نہیں هیں ۔ بلکہ اس میں ان آوازوں کو دوسرے حروف سے ظاهر کیا گیا هے اور اس صورت حال نے هندوستانی لسانیات میں وہ الجھنیں پیدا کردی هیں کہ ختم هونے هی کو نہیں آتیں۔ ذیل میں ان حروف کے تبادل کا ایک مختصر سا نقشہ پیش کرتا هوں ۔

۱ ـ ایرانی خ	=	ویدک س
بیخ (جڑ)		وس
فرخو (بہت سی شاخوں والا درخت)		پرسو
خار (کانٹا)		سار

۲ - ایرانی خ	=	ویدک ک
شوخ		شوک
ریخت (گرایا)		رِکت (خالی کیا)
خرد (عقل)		کرتہ
تخم (بیج)		توکم
خری (خریدن)		کری
. خروش (شور و غوغا)		کرش
برخ (تهوڑا)		ورک (ٹکڑا)
فراخ (کشاده)		پرک
خرامیم (هم چلیں)		کرامیم
یَخت (ملا هوا)		یَکت
آخت (کها هوا)		آکت
ریخ (ذلیل شے)		ریک
۳ - ایرانی خ	=	ویدک ش
خف (سَم - کُهر)		شپھ
خشک		شَشک
حاک		شک
سَخ (بولنا)		شَش
خَست (تکان ، ماندگی)		شَست
حوب		شَبھ
۴ - ایرانی خ	=	ویدک چ
ریخ (گرنا - پهیلنا)		رِچ
بیخ (چهاننا)		وِچ

واخ (بولنا)		وچ
۵ - ایرانی ز	=	ویدک س
گَز (کاٹنا)		گهَس
زغند		سیند
۶ - ایرانی ژ	=	ویدک ش
ورزاو (بیل)		ورشبھ
مُرز (معاف کرنا-آمرزیدن)		مرش (صاف کرنا)
زیبا		شوا
زاو (طاقت)		شَو
۷ - ایرانی ز	=	ویدک ج
بزر (هتهیار)		بجر
زانو		جانو
اوستا زانوه		
فارسی جدیده زاده		جاتو
یزدان		یجتام
اوستا زور (طاقت)		جبر
زَود (جلدی)		جوت
۸ - ایرانی ز	=	ویدک ہ
اوستا زست (هانه)		هست
بازو		باهو
اژ (بڑا سانپ)		اهی
آزر (آگ)		اَهَر (دن)
زد (مارا)		هت
اوستا اَزم (هم) =		

فارسی قدیم ، ادم		اہم
۹ - ایرانی ز	=	ویدک ج
مرز		مرچ
روزن		روچن
پز (پکانا)		پچ
۱۰ - ایرانی غ	=	ویدک گ
بغ		بھگ (خدا)
مرغ (پہاڑی بکری)		مرگ (ہرن)
غردہ (گاڑی)		گرت
یوغ (جوا)		یگ
۱۱ - ایرانی غ	=	ویدک گھ
دغ (دودھ دوہنا)		دگھ
دغ (جلانا)		دگھ
میغ (بادل)		میگھ
مغ (دولت)		مگھ
آغا (کلمۂ احترام)		آگھا
دروغ (جھوٹ)		دروگھ
مغ (مست ہونا)		مگھ
غن (مارنا) تیل نکالنے والا اوزار		گھن
۱۲ - ایرانی غ	=	ویدک ہ
دغ (دوہنا)		دہ
دغ (جلانا)		دہ
میغ (بادل)		مہ

مغ (مست ہونا)		مہ
دروغ		درہ
غن		ہن
(آ) روغ (ڈکار)		رہ (اوپر چڑھنا)
۱۳ - ایرانی ف	=	ویدک پ
فرا		پر
تفت		تپت
فرشتہ		پرشٹھا
ہفت		سپت
آفت (افتادن)		وپت (گرتا)
۱۴ - ایرانی ف	=	ویدک پھ
کف		کپھ
خف		شپھ
۱۵ - ایرانی ف	=	ویدک بھ
گرف (گرفتن)		گربھ
ناف		نابھی

اس مقام پر میں پراکرت کا تبادل بھی بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس میں ٹ ، ڈ ، ڑ اور ان کے مہاپران باہم متبادل ہوتے تھے ، مثلاً ٹنڈا (ہا تھ کٹا انسان)=ڈنڈا (شاخیں کٹا درخت) مٹھ بھیڑ = مڈھ بھیڑ ، بڈھا = بوڑھا ، مٹھی = منڈھی = مڑھی وغیرہ - ان کے علاوہ پھٹ، پھاڑ - پھوٹ، بھوڑ - جھٹ، چھوڑ وغیرہ کے دہرے روپ بھی اس کے شاہد ہیں - مارواڑی میں اردو ہی کی طرح ڈ اور ڑ کے لئے دو الگ الگ حروف مقرر ہیں،

لیکن دیو ناگری میں ڈ ، ڈھ پر ایک نقطہ لگا کر ڑ ، ڑھ کی علامات بنائی گئی ہیں۔ اردو کا عام اصول یہ ہے کہ طویل حرف علت کے بعد ڈ، ڈھ کی آوازیں ہمیشہ ڑ ، ڑھ ہوجاتی ہیں، جیسے کوڑی ، گاڑھا ، بھیڑ، گاڑی وغیرہ ۔ مرہٹی میں ڈ کے تلفظ کے لئے یہ اصول ہے کہ لفظ کی ابتدا اور تشدید کی حالت میں ڈ کی آواز دیتی ہے ورنہ دوسری صورت میں ڑ سے بدل جاتی ہے ، چنانچہ نہ موجودہ زبانوں میں ڑ ، ڑھ سے کسی لفظ کی ابتدا ہوتی ہے نہ انہیں مشدد بولا جاتا ہے ۔

پراکرت میں ل، ن، ر کا تبادل بھی عام ہے، جیسے بانسلی ، بانسری ۔ تتلی ، تیتری ۔ بورانا ، بولانا ۔ لون ، نون ۔ لانگھنا، نانگھنا وغیرہ ۔ البتہ ہند شمالی کے مشرق میں ل اور مغرب میں ر کی کثرت ملتی ہے اور اردو کے ر کی جگہ برج بھاشا میں بیشتر ل بولنے کا رجحان پایا جاتا ہے، جیسے اردو کا لا ، برج بھاشا کا رو وغیرہ ۔

پراکرت تبادل کے تیسرے گروہ میں مجھے گ اور ب کے حروف بھی نظر آتے ہیں مثلاً، لگدی = لبدی ، بگولا = ببولا ، سگ (سگرو۔ برج بھاشا) = سب ، سابودانہ = ساگودانہ ، چوبا (کسی تقریب کا بھیجا ہوا کھانا) = چوگا (رزق۔ غذا) ، گولا = بولا (باجرے کے دانے کا چھلکا یا بھوسی) وغیرہ کے علاوہ بعض موجودہ زبانوں (اردو ، پنجابی ، راجستھانی، برج بھاشا وغیرہ) میں علامت مستقبل گ ہے (جیسے جائے گا ، جائے گو۔ کھائے گا ، کھائے گو وغیرہ) اور بعض زبانوں میں ب سے مستقبل بنتا ہے، جیسے اودھی چلبوں (میں چلوں گا) ، چلب (ہم چلیں گے) ، چلبے (تو چلے گا) ، چلبو (تم چلوگے) وغیرہ ، بلکہ بعض اوقات چلب سے ہی تمام صیغوں کا کام نکالا جاتا ہے ۔ گجراتی تینے اے کام کربوں (تو یہ کام کرے گا) ، مارے آ چپڈی بانچبی (میں وہ کتاب پڑھوں گا) ۔ بہاری مربوں (میں ماروں گا) ، آڑیا کربوں (میں کروں گا) ، بنگالی کوربو (میں کروں گا) ، کوربے (تو کرے گا) ، آسامی کورب (وہ کرے گا) ۔ مرہٹی ملگیانیں پوتھی بانچابیں (لڑکا کتاب پڑھے گا) تامل شے بیں (میں کروں گا) شول بیں (میں کہوں گا) ۔ اس کے علاوہ تامل میں گ بھی علامت مستقبل کے طور پر مستعمل ہے جیسے شے گیں (میں کروں گا) ، شول گیں (میں کہوں گا) وغیرہ ۔ اس کے علاوہ بھی گ اور ب کا تبادل دکنی زبانوں میں ملتا ہے ۔ غرض پراکرت تبادل کی یہ قسم اس بر صغیر کے طول و عرض کی تمام جدید زبانوں میں پائی جاتی ہے ۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ تبادل حروف کی بہت سی قسمیں ہندوستانی لسانیات کے دیسی اور بدیسی محققین علی العموم پراکرت میں تلاش کرتے چلے آرہے ہیں حالانکہ ان میں سے کچھ ہندیورپی زبانوں کی خصوصیات ہیں اور بعض سے پراکرت متعلق ہیں لیکن ویدک وسنسکرت میں دونوں ہی جمع ہوگئی ہیں ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان زبانوں میں آریائی اور دراوڑی یعنی ہند یورپی اور ہندوستانی دونوں کے

روپ اکٹھے کر دئے گئے ہیں ۔ اس سلسلے میں یہ نکتہ بھی محققین کے پیش نظر رہنا ضروری ہے کہ حروف کے جتنے تبادل بیان کئے جاتے ہیں ان میں سے کچھ آوازوں سے متعلق ہیں اور بیشتر ایسے ہیں جو الفاظ کے مختلف مکتوبی روپوں سے پیدا ہوگئے ہیں ۔ چنانچہ حلقی و حنکی حروف کا تبادل محض لپی سے متعلق ہے اور مصیت و غیر مصیت کا تلفظ سے ۔ البتہ مخی و دندانی اور الپ پران اور مہا پران کے تبادل کا ایک حصہ تلفظ کے اختلاف سے تعلق رکھتا ہے اور دوسرا محض تحریر سے ۔ اسی وجہ سے الفاظ کے صحیح تلفظ کے لئے اس دوسرے حصے پر بھروسا نہیں کیا جاسکتا ۔ و، ہ ، ی کی آوازیں پراکرت میں سرے سے ناپید ہیں اور صرف آریوں کے اثر سے ہمارے یہاں آئی ہیں، اس لئے پراکرت کا ان کے کسی تبادل سے کوئی تعلق نہیں ہے ۔ البتہ پراکرت کے وہ تین تبادل جن کا میں نے آخر میں ذکر کیا ہے اس کی آوازوں کے تبادل ہیں اور پاک و ہند کے طول وعرض میں آج بھی پائے جاتے ہیں ۔ ہند یورپی میں ی ، ج اور و، ب کے تبادل لپی سے پیدا ہوئے ہیں اور س ، ہ کا تبادل ان حروف کے حشوی اندراج پر دلالت کرتا ہے جو صرف لکھے جاتے تھے ، بولے نہیں جاتے تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ بعض حالات میں س کا ہ سے تبادل ہوجاتا ہے اور پھر ہ بھی ساقط ہوجاتی ہے ۔ چونکہ یہ مقالہ محض تبادل حروف سے متعلق ہے اس لئے سقوط حروف کے بارے میں پھر کبھی عرض کروں گا ۔

ترقیٔ اردو بورڈ کی قابل مطالعہ کتابیں

جزبات نادر

حصہٴ اول و دوم نیز مثنوی لالہ رخ یک جلد
نادرعلی خاں نادر کاکوری (متوفی ۱۹۱۲ء) کے
جدت آفریں کلام کا مجموعہ ۔ دیدہ زیب طباعت

مع مقدمہ
از جناب ممتاز حسن
ناشر : اردو اکیڈمی (سندھ) کراچی
قیمت مجلد مع گرد پوش ، دس روپے

سرسید راس مسعود

''وہ یادگار کمالات احمد و محمود''

جمیل نقوی

" بڑے شخص کی سب سے بڑی علامت یہ ہے کہ جب تک وہ زندہ ہے اور اپنے کام پر ہے دوسرے شخص کی ضرورت محسوس نہ ہو اور اس کے بعد سوا اس کے دوسرے پر نظر نہ پڑے ۔" ہم بڑا شخص اسے کہیں گے جو ایثار کو کام فرماتا ہے ، جو اپنی اغراض اور خواہشات پر لات مار کر دوسروں کی دستگیری کرتا۔" یہ بابائے اردو مولوی عبدالحق کے الفاظ ہیں ۔ نواب مسعود جنگ سر سید مسعود میرے نزدیک اس معیار پر پورے اترتے ہیں۔ ان میں مذکورہ صفات بدرجہ اتم موجود تھیں اور تمام عمر یہ خصوصیات ان کی شخصیت پر حاوی رہیں۔ نہ صرف یہ کہ وہ ایک بڑے باپ کے بیٹے اور ایک بہت بڑے دادا کے پوتے تھے بلکہ خود بھی ایک عظیم شخصیت کے مالک تھے ۔ یہ صحیح ہے کہ بڑائی انہیں ورثے میں ملی تھی لیکن اگر انسان میں ذاتی جوہر نہ ہو اور ایسی فطری صلاحیتیں اس کے خمیر میں رچی بسی نہ ہوں جو اسے دوسروں سے ممتاز کرتی ہیں تو وراثت نسبی ایک بے معنی شے ہو کر رہ جاتی ہے اور اس پر " پدرم سلطان بود " والی پھبتی صادق آتی ہے ۔ بقول شاعر مشرق :

خودی ہے مردہ تو مانند کاہ پیش نسیم
خودی ہے زندہ تو سلطان جملہ موجودات

درحقیقت بچپن ہی سے انہیں اس امر کا احساس تھا کہ سر سید کا پوتا اور جسٹس محمود کا بیٹا ہونا کیا معنی رکھتا ہے اور آگے چل کر قوم کو ان سے کیا کیا توقعات ہوسکتی ہیں ان کا یہ احساس عمر کے ساتھ ساتھ شدید ہوتا گیا۔ اور ان کے کردار کی تشکیل میں اس احساس نے بڑا اہم کردار ادا کیا ۔ استغنا ، خوداری ، حفظ نفس اور قوم پرستی کے جذبات کو ابھار کر ان کی فطرت ثانیہ بنادیا ۔

سر راس مسعود اپنے باپ دادا کی اعلیٰ صفات کا بڑا شگفتہ مجموعہ تھے ۔ بنیادی صفات تو بزرگوں کی تھیں ۔ شگفتگی کا عنصر آکسفورڈ کے ماحول اور جدید علوم کی آمیزش نے شامل کردیا تھا۔ ذہانت ، طباعی ، بذلہ سنجی ، نکتہ رسی ، خودداری اور وجیہ شخصیت انہیں اپنے فاضل باپ

جسٹس سید محمد محمود سے ورثے میں ملے تھے۔ حب الوطنی، بلند نظری، خلوص مقصد اور حصول مقصد کی سچی لگن، وسیع القلبی، حق گوئی و حق شناسی، بردباری اور خود اعتمادی، یہ تمام صفات عالیہ سر سید سے ان کو پہنچی تھیں۔ ان میں باپ سے زیادہ دادا کی شخصیت کی چھاپ بہت نمایاں تھی۔

بچپن سر سید کے آغوش محبت میں گذارا، لڑکپن میں سر تھیوڈور ماریسن اور ان کی شفیق بیگم کی نگرانی میں رہے جس نے آن کی ذات میں مشرقی و مغربی دونوں تربیتوں کی روح جمع کردی۔ ان سے ملنے والا ہر شخص یہ محسوس کئے بغیر نہ رہ سکتا تھا کہ دونوں تہذیبوں کا پورا رنگ ان کی شخصیت میں بڑے متوازن انداز میں رچا ہوا تھا اور وہ اس کا ایک نادر نمونہ تھے۔ مشرقی و مغربی زبان و ادب کے وسیع مطالع اور مختلف ممالک کی سیر و سیاحت کے دوران، مشاہدات کی گہرائی نے انہیں اپنی دور کی ایک اہم اور پرکشش شخصیت بنادیا تھا۔ وہ اس بر صغیر کے ان چند زعما میں سے تھے جن پر مغربی تہذیب و تمدن کا بالکل الٹا اثر ہوا تھا۔ مغربی تعلیم نے ان کے جذبہ حب الوطنی کو اور زیادہ ابھارا اور ان کی روح کو جو کافی عرصہ مغربی ماحول میں پروان چڑھی تھی خالص مشرقیت کے سانچے میں ڈھال دیا۔ وہ کم عمری ہی میں بلند مرتبے پر فائز ہو گئے تھے۔ کم و بیش پچاس سالہ زندگی میں انہوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دئے، خصوصاً برصغیر کی تعلیمی دنیا میں جو مہتمم بالشان کارنامے ان کی یادگار ہیں۔ انہیں پیش نظر رکھتے ہوئے خیال ہوتا ہے کہ اگر ان کی عمر اور وفا کرتی تو وہ اپنے پیچھے صالح اور زریں روایات کا ایک بڑا ذخیرہ چھوڑ جاتے۔ اردو زبان و ادب پر ان کے احسانات لافانی ہیں۔ بالخصوص جامع عثمانیہ کی شکل میں مادری زبان میں تعلیم کا جو نے مثال تجربہ ان کے ہاتھوں ہوا وہ جریدہ عالم پر ان کا دوام ثبت کرنے کو بہت کافی ہے۔ دوسری تعلیمی خدمات اس پر مستزاد ہیں۔

سر راس مسعود ۱۸۸۹ء میں بمقام علیگڑھ پیدا ہوئے۔ ۱۸۹۲ء میں علیگڑھ ہی میں ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس کے یادگار موقعے پر ان کی بسم اللہ کی تقریب منعقد ہوئی۔ اس زمانے کے سارے نامی گرامی مسلمان جو کانفرنس کے جلسوں میں شریک ہونے کو اطراف ملک سے وہاں آئے تھے، اس تقریب میں شریک تھے۔ یہ تقریب بھی اپنی نوعیت کی عجیب و غریب تقریب تھی۔ مہمانوں کو دھوم دھام سے دعوت دینے کے بجائے اس خوشی میں سر سید نے پانچسو روپے نقد کالج کو چندہ دیا۔ ان کی دیکھا دیکھی دوسرے مہمانوں نے بھی گراں قدر عطیات کالج فنڈ میں دئیے۔

بسم اللہ کے بعد تعلیم کا آغاز ہوا۔ ابتدا میں علیگڑھ کے مشہور حافظ بخشا سے قران مجید پڑھا اور اردو نوشت و خواند کی مشق کی۔ وقتاً فوقتاً سر سید خود بھی ان کے لکھنے پڑھنے کی نگرانی کرتے تھے۔ اس کے بعد علیگڑھ کالجیٹ اسکول میں داخل ہو گئے۔ ۱۸۹۸ء میں سر سید کا انتقال ہوگیا تو سر تھیوڈر ماریسن کی نگرانی میں تعلیم جاری رہی۔ ماریسن صاحب اس زمانے میں کالج کے پرنسپل تھے۔

۱۹۰۵ء میں میٹرک پاس کر لیا اور سرکاری وظیفے پر اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان چلے گئے اور نیو کالج آکسفورڈ میں شامل ہوگئے۔ یہ وظیفہ سر تھیوڈور کی کوشش ھی سے ملا تھا ۔ ماریسن صاحب جب لندن واپس چلے گئے تو وھاں بھی ان کی نگرانی کرتے رہے۔ماریسن صاحب اور ان کی بیگم دونوں میاں بیوی راس مسعود صاحب کو اپنے بیٹے کی طرح چاھتے تھے اور راس مسعود صاحب بھی ان کا بہت احترام کرتے تھے ۔ کوئی کام ان کے مشورے اور مرضی کے بغیر نہ کرتے ۔ یہ تعلق تمام عمر قائم رہا ۔

۱۹۱۰ ء میں آکسفورڈ سے سند فضیلت (بی ۔ اے آنرز) کی ڈگری حاصل کی ۔ ان کے تمام جاننے والوں نے اس بات کی تصدیق کی ھے کہ وہ نیو کالج کے ممتاز طلبہ میں شمار ہوتے تھے ۔ بقول مسٹر ایچ۔ اے۔ ال فشر " ان کے حسن صورت طلاقت لسانی ، پرجوش ھمدردیوں اور ٹینس کے میدان میں زور شور نے بہت سے لوگوں کو ان کا گرویدہ بنا دیا تھا اور وہ حقیقت میں کالج کے سب سے مقبول اور کامیاب طلبہ میں سے تھے۔ جہاں تک میں نگاہ دوڑاتا ہوں کوئی ایسا ھندوستانی طالب علم مجھے یاد نہیں آتا جو مسعود سے زیادہ آکسفورڈ کی زندگی میں پیر گیا ہو، جس نے آکسفورڈ کی بہترین تعلیم و تربیت کو ان سے بڑھ کر تحصیل کیا ہو۔

آکسفورڈ کی پڑھائی سے کامیابی کے ساتھ فارغ ہوکر اور لندن سے بیرسٹری کی سند لے کر وہ ھندوستان واپس آئے اور غالباً ۱۹۱۲ء کے آخر میں پٹنہ ھائی کورٹ میں پریکٹس شروع کی۔ پٹنے میں پریکٹس کا مشورہ سید عبدالعزیز صاحب (سابق وزیر تعلیم بہار و اڑیسہ) نے دیا تھا جو ان کے ساتھ لندن بیرسٹری کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ تھوڑے ھی عرصے بعد اس پیشے سے ان کی طبیعت اکتا گئی ۔ ایک مشہور مقنن باپ کی شہرت پشت پر تھی۔ خود بھی بے حد ذھین اور نکتہ رس تھے خطابت کے فن سے فطری لگاؤ تھا ۔ اگر ذرا جم کر کام کرتے تو بیرسٹری میں بڑا نام پیدا کرتے اور خوب دولت کماتے لیکن قدرت کو یہ منظور نہ تھا کہ سرسید کا پوتا اپنی فطری صلاحیتوں کو اپنے ذاتی مفاد پر ضائع کرے ۔ پریکٹس شروع کرنے کے تھوڑے ھی عرصے بعد ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے انھیں اس پیشے سے متنفر کر دیا۔ ایک مقدمے کی پیروی کر کے انہوں نے ایک شخص کو سزا کرا دی ۔ بعد میں انھیں احساس ہوا کہ وہ شخص بے گناہ تھا اور اسے سزا دلا کر انہوں نے اس کے اھل و عیال پر بڑا ظلم کیا ۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ وکالت کا پیشہ بظاھر ایک معزز پیشہ ھے لیکن کوئی شخص حساس ضمیر کے ساتھ اس پیشے میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ جب کبھی لوگ وکالت کے پیشے کا ذکر ان کے سامنے کرتے تو وہ اسے "دماغی بدکاری کا پیشہ" کہتے تھے۔

بہر حال بیرسٹری چھوڑ کر وہ انڈین ایجوکیشنل سروس (۱) میں شامل ہو گئے اور

---

(۱) ایک بزرگ جو راس مسعود صاحب مرحوم سے قریبی تعلق رکھتے تھے بیان کیا تھا کہ ابتدا ھی سے ان کا رجحان حب الوطنی اور قومی آزادی کی طرف تھا اور یہ بات انگریزوں کے اعلیٰ طبقے کو معلوم بھی تھی پٹنہ میں بیرسٹری شروع کرنے کے بعد انھوں نے قومی مسائل میں بھی دلچسپی لینا شروع کردی تھی ۔ انگریزوں کو یہ خوف ہوا کہ راس مسعود سیاست کے میدان میں اتر آئے تو مسلم عوام کی قیادت سنبھال لینا ان کے لئے کوئی بڑی بات نہ ہو گی ۔ اسی وجہ سے سر تھیوڈور ماریسن خاص طور سے لندن سے چل کر پٹنہ میں آئے تھے اور انھیں وکالت ترک کر کے تعلیمی دنیا میں داخل ہونے پر آمادہ کیا تھا ۔

کالیجیٹ اسکول پٹنہ کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ تعلیمی سرگرمیوں کی طرف یہ ان کا پہلا قدم تھا۔ ان کے دور صدارت میں پٹنہ اسکول نے بڑی ترقی کی۔ ۱۹۱۵ء میں آپ کا تقرر گورنمنٹ کالج کٹک میں تاریخ کی پروفیسری پر ہوگیا۔ کچھ عرصہ اس کالج کے وائس پرنسپل بھی رہے۔

تجربے سے ثابت ہوا کہ انھیں تعلیم و تعلم سے فطری لگاؤ تھا۔ انھوں نے جب آنکھ کھولی تو اپنے جلیل القدر دادا کو مسلمانوں کی بہبودی خصوصاً تعلیمی ترقی میں کوشاں اور ہمہ تن مصروف پایا۔ ان کا گھر مسلمانان ہند کی تعلیمی سرگرمیوں میں بہت بڑا اور بڑی حد تک واحد مرکز تھا۔ ایم۔ اے۔ او۔ کالج کے ٹرسٹیوں کے جلسے، محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس، مختلف تعلیمی کمیٹیوں کی نشستیں، آئے دن اسی قسم کی دوسری سرگرمیاں ان کی نظروں کے سامنے ہوتی رہتی تھیں۔ سرسید اپنی تعلیمی سرگرمیوں کے سلسلے میں اگر علی گڑھ سے باہر بھی جاتے تو مسعود ان کے دم کے ساتھ ہوتے۔ ظاہر ہے ایسے ماحول میں پرورش پانے والے بچے کے تحت الشعور میں اگر کوئی نصب العین مرتسم ہو سکتا تھا تو اسی قسم کا ہوگا جو اس کے نامور باپ اور زندہ جاوید دادا کا تھا۔ ان کے ابتدائی ماحول میں ایک پرعظمت گہما گہمی، ایک بلند تر مقصد کے حصول کی جد و جہد کا شور ہر وقت گونجتا رہتا تھا۔ جن بزرگوں کے جمگھٹے میں وہ چوبیس گھنٹے گھرے رہتے تھے ان میں کیسی کیسی باوقار شخصیتیں شامل تھیں۔ محسن الملک، وقار الملک، حالی، شبلی، نذیر احمد اور بہت سے دوسرے اس عہد کے مسلم زعماء۔ اسی ماحول کا اثر تھا جس نے راس مسعود کی آئندہ زندگی میں چار چاند لگائے۔ ان بزرگوں کے تمام اوصاف حمیدہ اور بیش بہا تعلیمی تجربوں نے ان کی زندگی کی راہ متعین کی اور وفات پر سر عبدالقادر جیسے ہمہ داں بزرگ کو یہ کہنے پر مجبور کیا کہ "مسعود اگر باپ دادا کی عمر پاتے تو نہ جانے کہاں تک پہنچتے مگر انھوں نے وہ منزلیں جو تھوڑوں نے بڑی عمر میں طے کی تھیں جلد طے کر ڈالیں اور چند روزہ دنیا کی آخری منزل کو اچانک جالیا"۔ دادا کے دل میں ملک و قوم کی خدمت کی جو لگن تھی وہ پوتے کو سینہ بسینہ پہنچی تھی۔ اور یہ اسی مصلح اعظم ہی کی محبت کا فیض تھا کہ راس مسعود کی زندگی کا کوئی زمانہ علمی و تعلیمی انہماک سے خالی نظر نہیں آتا۔

کٹک کالج کی ملازمت کو ابھی ایک سال بھی نہ گذرنے پایا تھا کہ خسرو دکن کو محکمہ تعلیم کی نظامت کے لئے ایک موزوں شخص کی ضرورت پیش آئی۔ نظر انتخاب ان پر پڑی اور ۱۹۱۶ء کے اواخر میں ان کی خدمات گورنمنٹ انگریزی سے حیدرآباد میں مستعار لے لی گئیں۔ حیدرآباد میں نظامت تعلیمات پر نواب عمادالملک، ڈاکٹر سراج الحسن، المالطیفی جیسے قابل اور ماہرین تعلیم بزرگ مامور رہ چکے تھے۔ سر راس مسعود کی عمر اس وقت صرف انتیس سال کی تھی جب وہ اس اہم عہدے پر فائز ہوئے ان کے بارہ سالہ دور نظامت میں ابتدائی اور تحتانیہ تعلیم کو جو وسعت ہوئی اور اعلیٰ تعلیم میں جو ترقی ہوئی وہ حیدرآباد دکن کی تعلیمی تاریخ کا زریں باب ہے۔ چند

سال کے عرصے ہی میں ہر قسم کے تعلیمی اداروں کی تعداد چوگنی ہوگئی یعنی ۱۹۱۵ء میں مدارس کی تعداد ۱۲۵۴ اور طلبہ کی تعداد ۹۳۲۸۹ تھی اور ۱۹۲۸ء میں جب وہ اس خدمت سے سبکدوش ہوئے، مدارس کی تعداد ۲۱۸۸ اور طلبہ کی تعداد ۲۷۱۸۲۱ تھی۔ انہوں نے مدارس اور طلبہ کی تعداد بڑھانے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اساتذہ کی معاشی بہبودی کے سلسلے میں بھی گرانقدر خدمات انجام دیں۔ ان کے لئے معتد بہ تنخواہیں اور پرکشش ٹائم اسکیل مقرر کرائے تاکہ اعلیٰ قابلیت کے لوگ اس پیشے میں داخل ہو سکیں۔ سرشتہ تعلیمات، حیدرآباد کا ضابطہ (کوڈ) بھی پہلی دفعہ انہیں نے نافذ کیا۔

حیدرآباد دکن میں ان کے دور نظامت کا مہتمم بالشان کارنامہ دارالترجمہ کا قیام اور جامعہ عثمانیہ کی تاسیس ہے۔ بقول مولوی عبدالحق مرحوم "جس زمانے میں یہ حیدرآباد آئے تو یونیورسٹی قائم ہونے کی ابتدائی تحریک ہوچکی تھی۔ مسعود اول اول مذبذب رہے کیونکہ اس وقت دیسی زبان کے ذریعے سے اعلیٰ تعلیم دینے کا مسئلہ ایسا تھا جو مشکل سے کسی کے خیال میں آسکتا تھا۔ اور اگر خیال میں آئے بھی تو اس کا عمل میں لانا ایک ڈراونا خواب معلوم ہوتا تھا۔ ساری مشکل یہ تھی کہ ہندوستان کی کوئی زبان اس بار کی متحمل نہیں ہوسکتی تھی۔ لیکن جب کامل غور اور گفتگو کے بعد انہیں اس امر کا یقین ہوگیا کہ صحیح طریقہ یہی ہے اور تعلیم کا حقیقی منشا صرف اپنی زبان ہی کے ذریعے سے پورا ہوسکتا ہے تو انہوں نے پورے انہماک کے ساتھ اس منصوبے کو عمل میں لانے کی تائید کی جسے اس وقت بعض لوگ جنون سے تعبیر کرتے تھے۔ اور اکثر اس جسارت پر حیرت زدہ تھے اور اس جدت بلکہ بدعت کو شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے۔" آخر ۱۹۱۷ء کے آغاز میں خسرو دکن نے جامعہ عثمانیہ کے قیام کا فرمان صادر فرمایا۔ اس اسکیم کو عملی جامہ پہنانے میں سر اکبر حیدری اور پروفیسر کاردے بھی پیش پیش تھے سر راس مسعود نے اپنی رپورٹ بابت ۱۹۱۷ء (۱۳۲۶ف) میں اس تاریخی واقعے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "یہ سال تعلیمات کی تاریخ میں بہت یادگار رہے گا جس میں حضرت اقدس و اعلیٰ نے فرمان مبارک کے ذریعے جامعہ کے قیام کا حکم صادر فرمایا، جس کا نام "جامعہ عثمانیہ" ہوگا۔ اس میں انگریزی لازمی ہوگی مگر دوسرے فنون کی تعلیم مادری زبان میں دی جائے گی۔ یہ جامعہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے ہندوستان میں پہلا جامعہ ہوگا۔ ایک زمانہ آئے گا کہ حیدرآباد ہی سارے ہندوستان میں صحیح تعلیم کا حقیقی مرکز ہوگا۔ جہاں طلبہ اطراف و اکناف سے جوق درجوق شرکت کے لئے آئیں گے اور اس علمی سرچشمے سے سیراب ہوں گے۔" سرسید اعظم نے چالیس پچاس برس پہلے ورناکیولر یونیورسٹی کا جو خواب دیکھا تھا آخر اس کے پوتے نے اس خواب کو ایک حقیقت بنادیا۔ بمصداق "اگر پدر نتواند پسر تمام کند۔" اسی سال جامعہ عثمانیہ کا دارالترجمہ بھی قائم ہوگیا اور دیکھتے ہی دیکھتے فارسی، عربی اور انگریزی کی مشہور و مستند تصانیف کی ایک کثیر تعداد اردو میں منتقل ہو گئی۔ ان گراں بہا تراجم نے نہ صرف یہ کہ جامعہ

عثمانیہ کی نصابی ضروریات کو پورا کیا بلکہ اُردو نثر کے دامن کو ہمہ علوم کے جواہر سے مالا مال کردیا ۔ جو کام گذشتہ سو برس میں نہ ہوا تھا (۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کے قیام سے لےکر ۱۹۱۷ء تک) وہ چند سال میں اس تیز رفتاری سے پایۂ تکمیل کو پہنچا کہ دنیا حیرت زدہ ہوگئی اور اُردو زبان جس کی بے مائیگی کا بہانہ آئے اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بنانے میں حائل تھاایک قلیل عرصے میں دنیاکی مشہور زبانوں کی صف میں شامل ہوگئی۔ کاش یہ سلسلہ تراجم کچھ دیر اور قائم رہتا تو اُردو کے دامن میں نہ جانے کتنے انمول ہیرے اور سمٹ آتے ۔

جامعہ عثمانیہ کا باقاعدہ افتتاح ۲۸۔اگست ۱۹۱۹ء کو ہوا اور جب تک کسی مستقل صدر جامعہ کا تقرر عمل میں نہ آیا، سر راس مسعود اپنی مستقل ذمہ داریوں کے دوش بدوش جامعہ کی صدارت کے فرائض بھی انجام دیتے رہے ۔ ۱۹۲۰ء میں جب نواب سرحیدر نواز جنگ بہادر برطانوی ہند میں چند ماہ کے لئے اپنی خدمت پر واپس گئے تو ان کی جگہ نواب مسعود جنگ کا منصرمانہ تقرر معتمدی تعلیمات پر بھی ہوا اور وہ اس خدمت کو تقریباً چھ ماہ نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے۔ ۱۹۲۱ء (۱۳۳۰ف) میں آپ نے مدارس فوقانیہ انگریزی کے علاوہ مدارس فوقانیہ عثمانیہ بھی قائم کئے جن میں ذریعۂ تعلیم اُردو زبان قرار دی۔ یہ مدارس آگے چل کر جامعہ عثمانیہ کے اصول پر اس کے معاون بنے۔۱۹۲۳ء (۱۳۳۲ف) میں آپ نے ایک ٹکنیکل ادارہ "عثمانیہ ٹکنیکل انسٹیٹوٹ" کے نام سے دارالضرب (حیدرآباد) میں قائم کیا جس کا مقصد معمولی نصاب کے ساتھ ساتھ صنعتی تعلیم کو فروغ دینا تھا ۔

۱۹۲۴ء (۱۳۳۳ف) میں آپ سرکار کی جانب سے جاپان کی تعلیم کے نظم و نسق کا مطالعہ کرنے کے لئے جاپان گئے ۔ وہ تقریباً تین ماہ تک ٹوکیو اور اس کے نواح میں پھرتے رہے اور ہر ایک کالج اور تعلیمی ادارے کا معائنہ کیا ۔ پرنسپلوں سے ملاقاتیں کیں ، جماعتوں میں دورہ کیا ، زنانہ کالج بھی دیکھے ۔ اپنے قیام جاپان میں جاپانی تعلیم کا بھر پور مطالعہ کرکے حیدرآباد واپس آئے تو اپنے اس تجربے کا نچوڑ' جاپان کا تعلیمی نظم و نسق ' کے نام سے کتابی شکل میں پیش کیا ۔ اس کتاب کے دیباچے میں آپ نے لکھا ہے کہ "جو کچھ میں نے جاپان میں دیکھا ہے اس نے میرے اس یقین میں اور زیادہ وثوق پیدا کردیا کہ جامعہ عثمانیہ کو قائم کرنا اُن عہد آفریں تدابیر میں سے ایک ہے جو انسان کے کاموں اور کوششوں کو صدیوں تک متاثر کرتی رہتی ہیں۔ مورخ اس جامعہ کی طرف اشارہ کرکے بتلائیں گےکہ یہی اصل محرک اس علمی اور دماغی ترقی کا ہے جو ہمارے ملک سے ایک دن ظہور میں آنے والی ہے اور جب آئندہ نسلوں کو معلوم ہوگا کہ عاقبت بینی اور دوراندیشی کس ضمیر روشن کی تھی جس نے ہندمیں سب سے پہلے تعلیم کو ایک صحیح اور فی الواقع بنیاد پر قائم کیا تھا تو نہایت تعظیم اور عقیدت سے اس شاہ ذی جاہ کا نام ان کی زبان پر آئے گا ۔"

۱۹۲۵ء (۱۳۳۴ف) میں وہ پھر رخصت لےکر

ایک دفعہ جاپان، کوریا اور چین تشریف لے گئے اور اب کی دفعہ کوریا اور چین کی تعلیمی حالت کا غائر مطالعہ کیا۔

گذشتہ بارہ سال کے تجربوں، مشاہدوں اور غور و فکر نے ان کے تعلیمی نظریات کو ایک سطح پر قائم کر دیا۔ ان کا دلی عقیدہ تھا کہ موثر اور سچی قومی تعلیم وہی ہوسکتی ہے جو طلبہ کی مادری زبان میں دی جائے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہندوستان کے ہر حصے میں الگ الگ یونیورسٹیاں ہوں جو مختلف دیسی زبانوں میں تعلیم دیں۔ یہ خیال مرحوم نے مختلف موقعوں پر شد و مد سے ظاہر کیا۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ بنارس، ریونشا کالج کٹک کے سالانہ جلسے اور کلکتہ کے تعلیمی ہفتے میں جو خطبہ ہائے صدارت انہوں نے پڑھے، ان میں اس مسئلے پر مدلل بحث کی ہے۔ عملاً انہوں نے اس تحریک کی تائید اس وقت کی جب ہندوستان کا تعلیم یافتہ طبقہ اسے سننے کے لئے بھی تیار نہ تھا۔ اندور میں ہندی یونیورسٹی کے قیام کے لئے جو کمیٹی مقرر کی گئی، مرحوم اس کے پرجوش ممبر تھے۔

وہ قومی تعلیم اس تعلیم کو سمجھتے تھے جو ایک ملک کے باشندوں کو خود انہیں کے ہم وطنوں کے ذریعے سے انہیں کے ملک کی زبان میں دی جائے۔ ایسی تعلیم جو ملک کی دیسی زبانوں میں دی جائے ان لوگوں کا جز و دماغ ہو سکتی ہے جو اس ملک میں پیدا ہوئے ہیں۔ یہ کہنا کہ قومی زبانوں میں تعلیم دینا ایک آزمائشی کام ہے ان کے نزدیک سراسر غلط تھا۔ ان کے خیال میں آزمائشی کام دراصل انگریزی زبان میں تعلیم دینا تھا جو اتفاقیہ طور پر مسلط ہوگئی ہے۔ انگریزی زبان میں جو علمی ذخیرے ہیں ان کے وہ بہت مداح تھے لیکن ساتھ ہی اس کی وضاحت وہ اس طرح کرتے تھے کہ انگریزی زبان کی تمام تخلیقات انگریزوں نے اپنی قومی زبان ہی میں کی ہیں اور اس وجہ سے ان کی خداداد قابلیتوں کو نشوونما کا بھرپور موقع ملا ہے۔ انگریزوں کو جرمن زبان میں تعلیم دی جاتی تو کیا وہ ایسی بیش بہا تصانیف پیش کر سکتے؟ بجنسہٖ یہی حال ہمارا ہے۔ جرمانی اور انگریزی زبانوں میں تو بہرکیف دور پرے کا کوئی رشتہ بھی نکل آئے گا لیکن انگریزی اور ہندوستانی زبانوں میں تو سرے سے کوئی واسطہ ہی نہیں ہے۔ جب مسلمانوں کے چھ سو سالہ دور حکومت میں فارسی عوام الناس کی زبان نہ ہو سکی تو موجودہ اتفاقی حکمرانوں کی زبان کس طرح ہماری قومی زبان ہوسکتی ہے اور ہماری قومی ضروریات کو پورا کرنے کی اہل ہوسکتی ہے۔ وہ ہمیشہ اس بات پر زور دیتے تھے کہ قومی زبانوں میں تعلیم دے کر اپنے طریقۂ تعلیم کو دوامی بنیادوں پر قائم کرنا ہماری قومی بقا کے لئے ازحد ضروری ہے۔

۱۹۲۸ء کے شروع میں سر سید راس مسعود نے زنانہ یونیورسٹی پونا میں جو افتتاحی تقریر کی تھی وہ ان کے تعلیمی نظریات کا نچوڑ معلوم ہوتی ہے۔ انہوں نے اس موقعے پر فرمایا تھا کہ ہندوستانی زبانوں کو ذریعۂ تعلیم بنانے سے انکار کرنے کے معنی یہ ہیں کہ خدا نے (نعوذباللہ) ہمیں ایسی زبان عطا کی ہے جو ہمارا ذریعۂ تعلیم نہیں بن

سکتی اور انگریزوں کو ایسی زبان دی ہے جو ارفع و اعلیٰ ہے ۔ انگریزی زبان کی تعلیم نے ہندوستانی گھروں میں ایک نفاق پیدا کر رکھا ہے ۔ عورتوں کی تعلیم تو پرانے طریقوں پر ہوتی ہے ۔ یعنی مادری زبان کے ذریعہ ۔ مرد انگریزی اسکولوں میں تعلیم پاکر عورتوں کے برعکس بالکل مختلف عقائد و خیالات پیدا کرتے ہیں جس سے نفسیاتی طور پر اور اخلاقی طور پر متضاد صورتیں پیدا ہوتی ہیں ۔ ملک کی خانگی زندگی میں اسی وقت اتحاد پیدا ہوسکتا ہے کہ جب مرد و عورت سب کی تعلیم و تربیت قومی زبان میں ہو ۔ اس سلسلے میں وہ جاپانی نظام تعلیم کے بےحد مداح تھے ۔

انہوں نے ایک موقع پر قومی زبان میں تعلیم پر زور دیتے ہوئے بڑے دردناک انداز میں اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی تھی کہ ہندوستان پہلے ہی ذاتوں میں بٹا ہوا ہے ۔ اس میں ایک ذات مزید پیدا ہو گئی ہے جو انگریزی میں تعلیم حاصل کر کے انگریزوں سے قریب اور اپنوں سے دور ہوتے جاتے ہیں ۔ ہندوستان ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں کثرت سے ایسے لوگ موجود ہیں جنہیں اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے شرم نہیں آتی کہ وہ ایک غیر ملک کی ادبیات کا علم اس ادبیات سے زیادہ رکھتے ہیں جسے ان کے اسلاف نے پیدا کیا تھا ۔ انہوں نے بارہا کہا کہ جو قوم اپنی تہذیب و تمدن کی عزت نہیں کرتی دنیا کی نظروں میں عزت پیدا نہیں کرسکتی اور کوئی قوم اس وقت تک اپنی تہذیب و تمدن کی عزت نہیں کر سکتی ، جب تک کہ وہ اس زبان کی عزت نہ کرے جس میں اس کا تہذیب و تمدن محفوظ ہیں ۔

لڑکیوں کی موجودہ تعلیم جو انہیں مغرب زدہ سوسائٹی کی رنگین تتریوں کا سستا نمونہ بنا رہی ہے ، مرحوم کو نا پسند تھی ۔ اس کی مذمت میں وہ ہندوستان کے قدامت پسندوں کے ہم زبان تھے ۔ وہ چاہتے تھے کہ ہندوستانی لڑکیوں کو جدید تعلیم ضرور دی جائے لیکن طریقہ ایسا اختیار کیا جائے کہ مشرقیت کے جوہر کی چمک ماند نہ پڑنے پائے ۔ یہ تھے ان کے تعلیمی نظریات جن میں قومی زبانوں کی اہمیت پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے ۔

انہیں حیدرآباد کی نظامت تعلیم پر فائز ہوئے بارہ سال ہوئے تھے کہ بقول مولوی عبدالحق مرحوم بھاگنے کی ٹھانی ۔ نظام گورنمنٹ سے ان کا معاہدہ تھا کہ دس سال خدمت کرنے کے بعد اگر وہ سبکدوش ہونا چاہیں گے تو گورنمنٹ انہیں ایک ہزار روپیہ وظیفہ دے گی ۔ چنانچہ وظیفہ لے کر اپنی صحت کی اصلاح کے لئے ولایت سدھارے ۔ ان کی صحت درحقیقت اچھی نہیں رہی تھی ۔ یہ واقعہ دسمبر ۱۹۲۸ ء کا ہے ۔

ابھی وہ یورپ ہی میں تھے کہ نظام گورنمنٹ نے انہیں پولیٹیکل سکریٹری کی خدمت پر لینا چاہا ۔ اسی اثنا میں مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کو بھی وائس چانسلر کی تلاش تھی ۔ وہاں ایک عجیب خلفشار برپا تھا ۔ یونیورسٹی کمیشن کی رپورٹ آچکی تھی ۔ گورنمنٹ اور عوام دونوں طبقوں میں مسلم یونیورسٹی کا اعتماد اٹھ چکا تھا ۔ اس کشمکش کے زمانے میں اتفاقاً سر تھیوڈر ماریسن نے میر ولایت حسین مرحوم کو ایک نجی خط میں اشارتاً مشورہ دیا کہ مسعود کو اس کے دادا کی جگہ بٹھا دو سب ٹھیک ہوجائے

گا۔ بہرکیف بڑی تگ و دود کے بعد ان کا نام یونیورسٹی کورٹ نے بالاتفاق اس اہم عہدے کےلئے منظور کر لیا اور انہیں اس کی باقاعدہ پیش کش کر دی۔

اس وقت دو متضاد نوعیت کے عہدے ان کو پیش کئے گئے تھے۔ ایک طرف تو حیدرآباد کی ملازمت جو بقول شخصے بڑی آرام دہ، ان کے مزاج کے مطابق اور دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ مالی اعتبار سے بھی بڑی جاذب توجہ تھی۔ دوسری طرف " مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری، بڑی مشقت طلب، ٹیڑھی اور کٹھن خدمت تھی، جو اچھے بھلے آدمی کو دیوانہ بنادے۔ اور بڑے بڑوں کو ناک چنے چبوادے۔ اس میں ہاتھ ڈالنا بلامبالغہ بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنا تھا۔ معلوم ہوتا ہے اس وقت سید احمد خاں کی روح نے مسعود کے دل پر القا کیا کہ پھولوں کی سیج چھوڑ کر کانٹوں بھری گدی قبول کر لی۔ ان کا یہ ایثار فی الحقیقت قابل قدر تھا۔" (عبدالحق)

۲۰ اکتوبر ۱۹۲۹ء کو انہوں نے علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری کا چارج لیا۔ ماہر تعلیم اور مدبر تعلیم کی حیثیت سے جو شاندار خدمات انہوں نے انجام دیں ان کی تفصیل کافی طویل ہے۔ وہ بڑے عزائم لےکر وہاں پہنچے تھے۔ ایک بلند نصب العین کو سامنے رکھ کر انہوں نے وہاں کام شروع کیا۔ غیر معمولی توجہ، محنت اور خلوص کے ساتھ معاملات کو جانچا۔ مشکلات کے حل نکالے۔ انتظامی گتھیوں کو سلجھایا۔ ترقی کی نئی نئی راہیں نکالیں۔ یونیورسٹی کی مالی حالت کو استوار بنیادوں پر قائم کیا۔ جس کا اندازہ اس امر سے ہوسکتا ہے کہ اپنے چند سالہ دور وائس چانسلری میں ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۳ء تک ۲۷ لاکھ روپیہ جمع کیا جبکہ اس سے دس سال پہلے (۱۹۲۱ء سے ۱۹۳۰ء تک) یونیورسٹی کو مختلف ذرائع سے صرف ۱۲ لاکھ روپیہ ملا تھا۔ مذکورہ ۳۵ لاکھ روپے کےعلاوہ وہ رقمیں الگ تھیں جو اپنے مخیر دوستوں اور بہی خواہوں سے طلبہ کی امداد کےلئے انہوں نے وصول کیں۔ علاوہ اعلیٰ قابل بیرونی اساتذہ کے تقرر کے جنہیں انہوں نے معقول تنخواہوں پر باہر سے بلاکر مختلف شعبوں میں تعینات کیا تھا ان کے عہد کا روشن ترین کارنامہ سائنس کالج کا قیام تھا۔ جس کی عمارت، ساز و سامان اور اساتذہ ان کی دور اندیشی، تجربہ کاری جوش عمل کا رہتی دنیا تک ثبوت دیتے رہیں گے۔ نہ صرف یہ کہ سائنسی شعبوں میں اعلیٰ تحقیقات کا آغاز کیا بلکہ دوسرے آرٹ کے شعبوں میں بھی ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں قائم کیں۔ ان تمام ترقیات سے یونیورسٹی کا کھویا ہوا وقار واپس آگیا۔ شہرت نے قدم چومے اور طلبہ کی تعداد کئی گنا زیادہ ہو گئی۔ انہوں نے ایک کم خرچ ہوسٹل بھی قائم کیا جہاں ذہین اور محنتی نادار طالبعلموں کی بود و باش کا ارزاں انتظام کیا گیا (آفتاب ہال) طلبہ کی امداد کرنے اور ان کا دل بڑھانے میں ان کا رویہ ایک مشفق باپ سے بھی زیادہ محبت آمیز تھا۔

۱۹۳۴ء میں انہوں نے ناگزیر حالات کی وجہ سے وائس چانسلری سے استعفیٰ دے دیا۔ باوجود مخلص احباب اور عقیدت مندوں کی انتہائی کوشش کے اپنا فیصلہ نہ بدلا اور یورپ چلے گئے۔

۱۹۳۳ء میں امیر افغانستان نادر شاہ مرحوم نے تعلیمی معاملات میں مشورہ کرنے کے لئے سرراس مسعود کو کابل بلایا ۔ اُن کے ساتھ ڈاکٹر سرمحمداقبال رح اور مولانا سیدسلیمان ندوی مرحوم بھی مدعو کئے گئے تھے ۔ امیر افغانستان نے واقعی ہندوستان کے مسلمانوں کے صحیح تعلیمی نمائندوں کا انتخاب کیا تھا ۔ اس سفر کی بدولت اُن کے تعلقات علامہ اقبال سے اور زیادہ گہرے ہوگئے جو مدت العمر باقی رہے ۔ سر راس مسعود کی موت پر علامہ اقبال کا مرثیہ ان کے دلی کرب اور شدید تاثر کا آئینہ دار ہے ۔

اُن کے عہد وائس چانسلری میں بڑے نامی گرامی لوگ یونیورسٹی کے دورے پر علی گڑھ آئے اور بےحد مطمئن واپس گئے ۔ انتظامی معاملات میں وہ کسی کی مداخلت پسند نہ کرتے تھے ۔ نظم و ضبط کے معاملے میں بےحد سخت گیر تھے ۔ خود بھی ضابطوں کی پابندی کرتے اور یونیورسٹی اسٹاف کو بھی مجبور کرتے کہ وہ کوئی بےقاعدہ عمل نہ کریں ۔ جس کے ثبوت میں لاتعداد مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں ۔ جن کا یہاں موقع نہیں ۔

انگریزوں کے متعلق ان کا رویہ عجیب و غریب تھا ۔ وہ اُن کی حاکمیت سے بے جا طور پر کبھی مرعوب نہ ہوئے ۔ اور انگریزوں کے ساتھ کافی عرصہ رہنے اور ان کی حاکمانہ حیثیت کے باوجود وہ ہمیشہ اُن سے تنے رہتے ۔ جو انگریز ان سے شان کی لیتے تو وہ بھی اُن سے مربیانہ طرز عمل اختیار کرتے ۔ وہ ذہنی طور پر اُن سے جھلائے رہتے ۔ جس خودداری اورحفظ نفس کا انہوں نے اکثرو بیشتر انگریزوں کے ساتھ مظاہرہ کیا اس کے متعدد واقعات اُن کے دوستوں سے سننے میں آئے جو اُن کے اعلیٰ کردار اور قومی و ملی وقار کو بلند رکھنے کی روشن اور قابل تقلید مثالیں ہیں ۔ ایسے ہی دو موقعوں پر میں خود بھی موجود تھا ، جب وہ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے ۔ ایک دفعہ کلکٹر علیگڑھ کی کسی حرکت سے یونیورسٹی کے طالبعلموں میں بڑا ہیجان پیدا ہوگیا ۔ بڑی لے دے مچی اور یہ شورش اتنی بڑھی کہ راس مسعود صاحب کے کانوں تک بھی پہنچ گئی ۔ طالبعلموں کے جوش کو تو سمجھا بجھا کر اُنھوں نے ٹھنڈا کردیا لیکن کلکٹر کوٹیلیفون کرکے اپنی کوٹھی پر بلایا ۔ وہ بےچارہ اُن کے آفس کے باہر ایک اسٹول پر تقریباً پون گھنٹے تک بیٹھا ہوا انتظار کرتا رہا ۔ انہوں نے جان بوجھ کریہ عمل اُس کے ساتھ روا رکھا تھا ۔ بہر حال پیشی ہوئی ۔ آپے بری طرح پھٹکارا اور اس کے سامنے ہی گورنر کو ٹیلیفون کرکے چوبیس گھنٹے کے اندر اندر علی گڑھ سے اس کا تبادلہ کرا دیا ۔

دوسرا واقعہ اُن کی عظیم شخصیت اور اعلیٰ قومی کردار پر روشنی ڈالتا ہے ۔ لارڈ اروِن وائسرائے ہند سے ان کے دیرینہ خصوصی مراسم تھے ۔ اپنے زمانۂ وائس چانسلری میں انہوں نے آپ ہے ریکٹر کی حیثیت سے یونیورسٹی کے سرکاری دورے پر مدعو کیا ۔ ریلوے اسٹیشن سے بڑے احترام کے ساتھ پرووائس چانسلر اور پروفیسروں کی معیت میں آپ دس بجے صبح یونیورسٹی لائے ۔ یک منزل میں لارڈ اروِن کو ریکٹر کی گون پہنانے کی تقریب ہوئی ۔ تمام پروفیسر اپنے اپنے شعبوں میں جا کر کام میں لگ گئے ۔ کلاسیں

صبح ہی سے لگی ہوئی تھیں۔ راس مسعود صاحب اور پرو وائس چانسلر ریمس بوتھم وائسرائے کو یونیورسٹی کے معائنے کے لئے لے کر چلے۔ اسٹریچی ہال دیکھنے کے بعد جب ہال کے برآمدے میں پہنچے تو راس مسعود صاحب نے لارڈ ارون سے کہا کہ مجھے دفتر میں ایک ضروری کام ہے۔ معاف کیجئے۔ ریمس بوتھم آپ کو کلاسوں میں لے جائیں گے۔ خدا حافظ! آپ سے دوپہر کے کھانے پر ملاقات ہو گی۔" یہ کہ کر لکڑی ٹیکتے ہوئے کھٹ کھٹ کرتے ہال کی سیڑھیوں سے اُتر کر دفتر چلے گئے۔ یہ عمل سرسید کا حقیقی جانشین ہی کرسکتا تھا۔ ورنہ ہم نے یہ بھی دیکھا تھا کہ ایک معمولی کلکٹر، ڈپٹی کلکٹر کا استقبال کرنے کے لئے نہ صرف یہ کہ وائس چانسلر صاحب کوٹھی کے دروازے تک جاتے تھے بلکہ ان کی موٹروں کے دروازے بھی خود ہی کھولتے تھے۔ میں نے ایک روز راس مسعود صاحب سے ڈرتے ڈرتے لارڈ ارون والے طرز عمل کی وضاحت چاہی تو انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں فرمایا کہ کلاسوں کا معائنہ کروانا پرو وائس چانسلر کا کام ہے۔ وہی یونیورسٹی کی تعلیمی سرگرمیوں کا سر براہ ہوتا ہے۔

کچھ روز انگلستان میں قیام کر کے واپس ہوئے تو نواب صاحب بھوپال مرحوم نے انھیں اپنا وزیر تعلیمات و تعمیرات مقرر کیا۔ بھوپال میں ان کا قیام تقریباً تین سال رہا۔ اس زمانے میں ان کا فطری چونچال پن ذرا بجھ سا گیا تھا۔ اب وہ پہلے سے مسعود نہ تھے۔ باغ و بہار، شگفتہ مزاج، لطیفہ گو لیکن پھر بھی "ریاض منزل" کی فضا میں ایک کشش تھی۔ لوگ جوق در جوق ان کے پاس آتے رہتے، فرائض منصبی کے سلسلے میں بھی اور ملنے جلنے کے لئے بھی۔ باہر سے آنے والوں میں علامہ اقبال رحؔ کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس زمانے کا ان کا بیش تر کلام ریاض منزل ہی میں صفحہ" قرطاس پر آیا۔ جس کے حوالے زبورعجم وغیرہ کے حاشیے پر ملتے ہیں۔

سر راس مسعود نے نواب صاحب بھوپال سے علامہ اقبال کو غالباً پانچ سو روپیہ ماہوار کا وظیفہ اس غرض سے جاری کرایا تھا کہ علامہ مغفور تفسیر قران انگریزی زبان میں لکھیں گے۔ ضروری کتابوں کی فراہمی کے لئے چند ہزار روپیہ کی رقم یک مشت بھی دلوائی تھی۔ علامہ نے یہ کام شروع بھی کردیا تھا۔ ادھر تو ۱۹۳۷ء میں راس مسعود صاحب کا انتقال ہوگیا ادھر خود علامہ رحؔ کی طبیعت بھی خراب رہنے لگی اور آخر ۱۹۳۸ء میں وہ بھی اللہ کو پیارے ہوگئے۔ دونوں بزرگوں کے ذہن میں مجوزہ تفسیر کا ایک خاص خاکہ تھا۔ اگر وہ لکھی جاسکتی تو عہد آفریں تصنیف ہوتی۔

وزارت بھوپال کے زمانے میں آپ نے ریاست میں تعلیم کے فروغ میں بڑی دلچپی لی۔ تعمیرات کے سلسلے میں ایک نیا ہسپتال بنوایا جو جدید آلات و ساز و سامان سے آراستہ کیا گیا تھا، ان کی نفاست مزاج اور حسن انتظام کی عمدہ مثال ہے۔

اسی زمانے میں آپ نے ایک اور قومی خدمت انجام دی۔ یہ واقعہ بھی ہماری ادبی و تعلیمی تاریخ کا ایک ناقابل فراموش واقعہ ہے۔ مولانا حالی کی یادگار میں بمقام پانی پت ایک ہائی

اسکول عرصے سے قائم تھا۔ لیکن ایک وقت ایسا آیا کہ اس کی مالی حالت بڑی سقیم ہوگئی۔ خواجہ سجاد حسین مرحوم خلف مولانا حالی نے جو اسکول کے سکرٹری تھے اس باب میں راس مسعود صاحب سے رجوع کیا اور آپ کے مشورے سے ۱۹۳۵ء میں مولانا حالی کی صد سالہ جوبلی منائی گئی۔ مرحوم نہ صرف یہ کہ خود پانی پت جا کر اس یادگار اجتماع میں شریک ہوئے بلکہ نواب صاحب بھوپال اور علامہ اقبال کو بھی اپنے ہمراہ وہاں لے گئے۔ اطراف ہند سے مولانا حالی کے بےشمار شیدائی پانی پت پہنچے۔ نواب صاحب نے ایک گراں رقم بطور امداد اسکول کو عطا کی۔ دوسرے مخیر حضرات نے بھی معتدبہ رقمیں نذر کیں۔ اس موقعے پر بابائے آردو مولوی عبدالحق اپنے ہمراہ حیدرآباد سے بہت سے لوگوں کو لے کر آئے۔ دھلی، علیگڑھ اور دوسرے مقامات سے بھی بہت سے معزز مہمان پہنچے تھے۔ علامہ اقبال نے اس یادگار موقعے کے لئے ایک نظم لکھی تھی جو جلسے میں سنائی گئی تھی۔ ابوالاثر حفیظ بھی وہاں موجود تھے اور نظم پیش کی تھی۔ لیکن یہ سب کچھ سر راس مسعود کے پر خلوص تعاون سے ممکن ہوسکا تھا۔

مرحوم کو آردو زبان و ادب سے جو فطری لگاؤ تھا اس کا بین ثبوت تو جامعہ عثمانیہ کا قیام تھا۔ اس کے علاوہ ہر ممکن موقعے پر وہ قومی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے پر مدت العمر مصر رہے۔

آن کا ادبی مذاق بڑا ستھرا اور پاکیزہ تھا۔ ادب و شاعری کے دلدادہ تھے۔ آردو ادب میں تو خیر اھل زبان کی شان تھی ھی، فارسی، انگریزی، فرانسیسی اور اطالوی ادب پر بھی زباںداں کی حیثیت رکھتے تھے۔ مطالعے حد وسیع تھا۔ انگریزی اور فرانسیسی زبان میں خود اھل زبان ان کا لوھا مانتے تھے۔ اھل زبان کی طرح ان دونوں زبانوں کے حسن و قبح پر بے تکان گفتگو کرتے تھے۔ ھزاروں اشعار نوک زبان تھے۔ فارسی میں مثنوی مولانا روم سے عشق تھا۔ حافظے کا یہ عالم تھا کہ تقریباً ساری مثنوی حفظ تھی۔ علامہ اقبال کا پورا کلام یاد تھا اس طرح کہ خود علامہ کو بھی اتنا یاد نہ تھا۔ حالی سنٹینری کے موقعے پر ہر روز صبح کو سارے سر برآوردہ مہمان آن کے خیمے میں جمع ہو جاتے تھے اور ان کی گفتگو سے، آن کے لطائف سے، ان کے طنز یہ جملوں سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ ایک صبح بیٹھے ہوئے حجامت بنا رہے تھے۔ چہرے پر صابن کے جھاگ لگے تھے۔ مسہری پر آن کی پشت پر علامہ اقبال نیم دراز لیٹے تھے۔ علامہ اقبال کی کسی نظم کا ذکر چھڑا۔ میں بھی وھاں حاضر تھا۔ راس مسعود صاحب نے جو اقبال کا کلام سنانا شروع کیا ہے تو تقریباً ایک گھنٹے تک سناتے رہے۔ ایک شعر پر خود وجد میں آگئے۔ پیچھے کی طرف جھک کر علامہ اقبال کا منہ چوم لیا۔ ان کا رخسارہ صابن سے لتھڑ گیا۔ راس مسعود صاحب نے ایک فرمائشی قہقہہ لگایا۔ باقی حاضرین بھی اس ھنسی میں شریک ہوگئے۔

آردو مطبوعات کے معیار سے بہت آزردہ ہوتے تھے۔ آن کی فرمائش پر بدایوں سے نظامی صاحب نے کئی کتابیں بڑی آب و تاب سے چھاپیں

جن میں مراثی انیس (مرثیہ علامہ طباطبائی) دیوان غالب اور چند کتابیں شامل تھیں۔ خوب صورت چھپی ہوئی کتاب کے عاشق تھے۔ جب کوئی اردو و فارسی کی کتاب عمدہ چھپتی اور انھیں پسند آجاتی تو بڑے شوق سے خریدتے اور دوسروں کو بھی خریدنے کی ترغیب دلاتے۔ تلمذ حسین صاحب نے حیدرآباد سے جب مثنوی مولانا روم کا ایک حسین و جمیل نسخہ شائع کیا تو میں نے حاصل کرکے ان کی نذر کیا۔ بے حد خوش ہوئے اور کئی روز تک اس کا تذکرہ ہر ایک سے کرتے رہے اور سونے سے پہلے گھنٹوں آپ پڑھتے رہے۔

اردو شعرا کے کلام کا انتخاب کرکے "انتخاب زریں" کے نام سے خود بھی طبع کرایا۔ اس کتاب کی ترتیب و اشاعت کا خیال انھوں نے پال گریو کی "گولڈن ٹریژری (خزانۂ زریں) سے لیا تھا۔ اس کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

"جو اصول میں نے اس انتخاب میں مدنظر رکھا ہے وہ نہایت سادہ ہے۔ میں نہ شاعر ہوں نہ فن سخن کا نقاد کامل، لیکن مجھے اپنی قوم کے فن شعر کے ساتھ سچا عشق ضرور ہے۔ میں نے وہی کلام انتخاب کیا ہے جس کو میرے دل نے پسند کیا۔ جن اشعار نے مجھ پر گہرا اثر کیا انہیں کو میں نے اس تذکرے میں جگہ دی ہے۔"

اس کے علاوہ سر سید کے ان تمام خطوط کو جو ان کے دوستوں اور مداحوں کے پاس بکھرے پڑے تھے یک جا کر کے کتابی صورت میں شائع کیا، جن کی حیثیت اس دور کی ثقافتی، اجتماعی، مذہبی اور ادبی دستاویز سے کسی طرح کم نہیں۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو یہ سارے جواہر پارے ضائع ہو جاتے۔

نواب عمادالملک بلگرامی کے انتقال کے بعد وہ انجمن ترقیٔ اردو کے صدر منتخب ہوئے۔ باوجود انتہائی مصروفیت کے وہ انجمن کے کاموں میں عملی دلچسپی لیتے رہے۔ گراں قدر عطیے حاصل کئے اور انجمن کی مالی حالت کو مستحکم کرنے میں مولوی عبدالحق مرحوم کی ہر طرح مدد کی۔ انجمن کے صدر کی حیثیت سے کہئے یا اردو کے شیدائی کی حیثیت سے۔ انھوں نے انڈیا آفس کی لائبریری میں موسیو گارساں دتاسی کے خطبات و مقالات کے مجموعوں کا سراغ لگایا۔ چند خطبوں کا خود بھی ترجمہ کیا لیکن اسے مکمل نہ کرسکے۔ بعد میں مولوی صاحب نے دوسرے فرانسیسی دانوں کے ذریعہ ان خطبات و مقالات کا ترجمہ کرا کے کتابی شکل میں شائع کیا۔ جب تک یہ خطبات و مقالات دستیاب نہ ہوئے ہماری ادبی تاریخ کے بہت سے گوشے بے نقاب نہ ہو سکے۔ راس مسعود صاحب کی رائے سے ہی انجمن ترقیٔ اردو کی طرف سے ۱۹۳۸ء میں اردو کونشن بلانے کا فیصلہ کیا گیا تھا جو ان کی موت کے بعد علیگڑھ میں منعقد ہوا۔ ہندوستان میں تمام چوٹی کے ادیب اس جلسے میں جمع ہوئے تھے۔ راس مسعود کے انتقال کی خبر سن کر مولوی عبدالحق مرحوم نے ایک خط میں مجھے لکھا تھا کہ "وہ آڑے وقت کام آنے والا اور مصیبت کے وقت سینہ سپر ہوجانے والا تھا۔ اس کی موت نے میری کمر توڑ دی ہے۔ اب وہ نہیں ہے تو میدان خالی خالی نظر آتا ہے اردو کے عاشق اور بھی بہت

ہے ہیں ۔ مگر مسعود کہاں ۔ "
اس اقتباس سے مولوی صاحب کے دلی کرب کا وہی لوگ اندازہ لگا سکتے ہیں جنھیں مولوی صاحب کو قریب سے برتنے کا موقع ملا ہے۔ مدتوں ان پر مسعود کی موت کا تاثر غالب رہا ۔
قصہ مختصر سر سید راس مسعود نہ صرف ایک جامع اور بالغ نظر ماہر وناظم تعلیم ہی تھے بلکہ وہ ایک چید عالم ، ذہین ادیب ، نکتہ سنج اور شعر و سخن کے نقاد بھی تھے ۔ آرٹ کے مبصر بھی تھے اور قدیم " تمدن کے بہترین عناصر کے وکیل اور اصلاح معاشرت اور جدید تہذیب کے حامی بھی "۔

زوال علم و ہنر مرگ ناگہاں اس کی
وہ قافلے کا متاع گراں بہا مسعود

(اقبال)

ترقیٔ اردو بورڈ کی ایک قابل مطالعہ کتاب

باغ و بہار (میرامن)

مرتبہ ممتاز حسین

ڈنکن فاربس کے مرتب کردہ نسخہ مطبوعہ ۱۸۴۷ء

پر مبنی

مع مقدمہ ، فرہنگ و حواشی

نفیس ٹائپ کی طباعت ، میرامن کی کلاسکی داستان کا سب سے مستند اور بہتر نسخہ

قیمت مجلد ٦ روپے ٥٠ پیسے

ترقیٔ اردو بورڈ ، اردو منزل ، جمشید روڈ ، کراچی ٥

سے طلب کریں

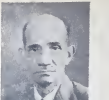

مسعود جنگ سید راس مسعود

نواب سعید جنگ

سید راس مسعود المخاطب بہ سر راس مسعود و نواب مسعود جنگ نہ صرف ایک ممتاز خاندان کی بنا پر بلکہ اپنی ذاتی وجاہت اور خداداد قابلیت کی وجہ سے بھی ہندوستان کے مشاہیر میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کے والد جسٹس سید محمود اپنے زمانے کے جید اور منتخب قانون داں تھے۔ سر سید احمد خاں ان کے دادا تھے جو ایک عظیم مصلح قوم، مدبر، بلند مرتبہ عالم اور ادیب تھے۔ دکن میں سید راس مسعود کا نام عموماً خطاب کے ساتھ لیا جاتا تھا، اس لئے میں نے عادتاً یہی نام استعمال کیا ہے۔ مسعود جنگ سے میرے دلی دوستانہ روابط کے سوا میری ننھیالی عزیزداری بھی تھی۔ اس لئے ان سے بہت بے تکلفانہ اور مخلصانہ میل جول رہا۔ بچپن ہی سے مسعود جنگ میں وجاہت کے ساتھ ذکاوت بھی نمایاں تھی۔ ہمارے بچپن کا ایک دور ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ میں گذرا۔ ہم دونوں اور میرے بڑے بھائی احمد مرزا مرحوم انگلش ہاؤس میں رہتے تھے۔ ہمارے دوسرے قابل ذکر ساتھی احمد سعید خاں نواب چھتاری، (سر) سکندر حیات خاں اور (سر) ناظم الدین تھے۔ کالج کے پرنسپل سر تھیوڈر ماریسن تھے۔ وہ مسعود جنگ کے "گارجین" بھی تھے۔ نواب محسن الملک کالج کے سکریٹری تھے۔ بعد ازاں ہم انگلستان میں ایک دوسرے سے ملے۔ مسعود جنگ آکسفورڈ میں نیو کالج میں زیر تعلیم تھے۔ میں لندن میں بار (قانون) کی تعلیم پاتا تھا۔ مسعود جنگ "بار" کے ڈنر میں شرکت کے لئے لندن آیا کرتے تھے اور ہمارے ساتھ قیام کرتے تھے۔ میں اور بھائی احمد مرزا ایک ہی مکان میں رہتے تھے۔ ہماری صحبت کے علاوہ ہمارا مکان اور یہاں کا کھانا مسعود جنگ کو پسند تھا۔ ان کو کھانوں کا بڑا اچھا ذوق تھا مگر جسامت کے لحاظ سے غذا زیادہ نہ تھی۔ مسعود جنگ دراز قد اور خوش شکل تھے۔ ان کا جسم گداز اور سڈول تھا۔ ہمارے دیگر ہم عصر ڈاکٹر مختار احمد انصاری (ممتاز قومی لیڈر) اور پروفیسر عبدالرحمن خاں تھے۔ ڈاکٹر انصاری ہم سے بہت محبت سے پیش آتے تھے۔ ان کی سفارش کی وجہ سے ہم چوٹی کے ڈاکٹروں کے پاس نصف فیس کی ادائی پر رجوع ہوسکتے تھے۔

پروفیسر عبدالرحمن خاں اپنے لندن کے قیام کی ڈائری مرتب کرتے تھے ، جس کو انھوں نے شائع بھی کیا ہے ۔ اس میں جگہ جگہ مسعود جنگ ، بھائی احمد مرزا اور میرا ذکر ہے ۔ لندن کی زندگی میں ہمارے شریک حال مسٹر ای ۔ ایم ۔ فاسٹر (Mr. E.M. Foster) بھی تھے ۔ یہ عالمی شہرت کے مصنف اور ناول نگار ہیں۔ ہندوستان میں ان کا ایک ناول (A Passage to India) زیادہ مشہور ہے۔ انگریز دوستوں میں یہ مسعود جنگ کے خاص الخاص دوست تھے۔ مسعود جنگ اور مسٹر فاسٹر ، او پیرا (Opera House) اور تھیٹر کے بڑے شائق تھے ۔ ان کے ہمراہ میں بھی کبھی کبھی چلا جاتا تھا ۔ مسعود جنگ اور مسٹر فاسٹر کو طمطراق کی ہوٹل یا ریسٹورنٹ میں جانا پسند نہ تھا ۔ لندن کا ایک محلہ سوہور اسکوائر (Sohor Square) ہے ۔ یہاں فرانسیسی اور اطالوی بہت سے چھوٹے چھوٹے ریسٹورنٹ ہیں ۔ یہ مقامات مصنف اور آرٹسٹ لوگوں کی آماجگاہ ہیں ۔ جب کبھی موقع ہوتا یہاں ہم تینوں لنچ یا ڈنر کھاتے اور پُر لطف گپ شپ رہتی۔ مسعود جنگ مسٹر فاسٹر سے ملنے کیمبرج جایا کرتے تھے ۔ فرصت ہوتی تو میں بھی ان کے ساتھ چلا جاتا تھا ۔ وہاں مسٹر فاسٹر کے علاوہ پروفیسر نکلسن (Nicholson) اور پروفیسر لوئی ڈکنسن (Loius Dickenson) جیسے نامور عالموں سے بھی مسعود جنگ کا میل جول تھا ۔

کھیلوں میں مسعود جنگ کو ٹینس کا شوق تھا ۔ نیو کالج کی ٹیم کے ممبر تھے۔ مجھے آکسفورڈ بلا لیا کرتے تھے۔ آکسفورڈ کے آنے جانے کے سلسلے میں پروفیسر ہارون خاں شیروانی سے دوستی کی بنیاد پڑی ۔ وہ عثمانیہ یونیورسٹی کی ملازمت کے ضمن میں حیدرآباد آئے اور یہیں بس گئے۔ مسعود جنگ کو فرنچ زبان اور فرنچ قوم کی بے تکلفانہ زندگی بہت پسند تھی ۔ فرنچ زبان فراٹے سے نہایت اچھے لہجے میں بولتے تھے ۔ فرنچ ادب کا بھی مطالعہ کرتے تھے ۔ مسعود جنگ کے ساتھ کئی مرتبہ پیرس جانے کا موقع ملا ۔ ایک مرتبہ ہارون خاں شیروانی سے پیرس میں ملنا ہوا ۔ وہ پیرس کے نواح میں ایک جگہ رہتے تھے جو آنبر کہلاتی ہے ۔ ایک دن مسعود جنگ اور میں ہارون خاں کے پاس لنچ کی دعوت پر گئے۔ یورپ میں گرمیوں کا زمانہ موسم بہار کا ہوتا ہے ۔ شام کا دھندلکا (ٹوائی لائٹ) رات کو نو دس بجے تک رہتا ہے اور بہت سہانا معلوم ہوتا ہے۔ آنبر کا چھوٹا سا سفر پُر فضا موسم کی وجہ پُرلطف رہا۔ گئے تو ٹرام سے تھے مگر واپس ریل سے ہوئے۔ اس وقت ایک عجیب نادانی کی حرکت سرزد ہوئی ۔ ٹرین میں چند ڈبے ایسے تھے جن کی چھت پر سیٹیں تھیں اس خیال سے کہ مناظر کی خوب سیر کریں گے ان سیٹوں پر بیٹھے ۔ یہ ہمارا پہلا تجربہ تھا۔ دو چار چھوٹے چھوٹے پلوں کے نیچے سے ٹرین گزری تو اس وقت حقیقت معلوم ہوئی اور اپنی حماقت کا علم ہوا ۔ منہ ہاتھ اور کپڑے دھوئیں کی شدت سے کالے ہو گئے۔ یہ واقعہ یاد کر کے بے اختیار اب بھی ہنسی آتی ہے۔ پیرس کا وہ حصہ جہاں سور بون (Sorbonne) یونیورسٹی ہے، لاٹن کوارٹر کہلاتا ہے ۔ یہاں سادہ زندگی کی ایک خاص فضا تھی ۔ ہمارا مکان ایک خوبصورت باغ کے بالمقابل تھا۔ اس میں

رنگ برنگ کے پھولوں کی کیاریوں اور فواروں کے ڈیزائن نہایت خوش نما تھے ۔ ہم روزانہ باغ کی سیر کرتے تھے ۔ باتوں باتوں میں یہاں ایک دن یہ خیال آیا کہ ایک کلب قائم کیا جائے ۔ خوش نصیبی ہے اس کلب کے قیام کی تاریخ ، اغراض و مقاصد اور قواعد کی یادداشت (مسعود جنگ کے قلم سے) ، بھائی سجاد مرزا سابق سکریٹری محکمہ تعلیمات حیدرآباد کے پاس محفوظ ہے ۔ اس یادداشت کے مندرجہ اغراض و مقاصد سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسعود جنگ کو اپنے ملک سے کتنی محبت تھی ۔ اور اس کے ہر شعبہ زندگی میں اصلاح و ترقی کے کتنے آرزو مند تھے ۔ کلب ، ۱۹ ۔ جنوری سنہ ۱۹۱۱ء کو وجود پزیر ہوا جس کے ممبر مسعود جنگ کے علاوہ بھائی احمد مرزا اور ہارون خاں اور میں تھے ۔ آپ کو کلب کا نام سن کر سخت حیرت ہوگی ۔ اس کا نام "لفنگا کلب" رکھا گیا ۔ یہ نام مسعود جنگ کا تجویز کردہ تھا ۔ اس کے پیچھے یہ تصور تھا کہ بالعموم انجمنیں جو قومی کاموں کی فلاح و بہبود کا دعویٰ کرتی ہیں ، شاندار نام رکھتی ہیں مگر در پردہ ذاتی اغراض کی تکمیل میں جد و جہد کی جاتی ہے ۔ بقول سعدی "برعکس نہند نام زنگی کافور ۔" لیکن ایسے عامیانہ و ظریفانہ نام کے باوجود یہ کلب مفاد عام اور قومی تعمیر کے کاموں کی انجام دہی میں مخلصانہ اقدام کے لئے قائم کیا گیا تھا ۔ مختصر یہ کہ ہم لوگ یکے بعد دیگرے تعلیم سے فارغ ہوکر وطن واپس ہوئے ۔ میں نے ریاست حیدرآباد کے محکمہ عدالت میں ملازمت قبول کی ۔ مسعود جنگ برطانوی ہند میں پیشہ وکالت میں داخل ہوئے ۔

چونکہ ان کی نازک اور حساس طبیعت کو ایسے پیشے سے مناسبت نہ تھی ، اس لئے اس کو ترک کر کے محکمہ تعلیمات میں ملازمت اختیار کی ۔ چند سال بعد مسعود جنگ نے ریاست حیدرآباد میں محکمہ تعلیمات کی ڈائرکٹر کی خدمت قبول کی ۔ اس وقت یہ محکمہ دقیانوسی حالت میں تھا ۔ انہوں نے اس کے نیم مردہ جسم میں تازہ روح پھونکی ۔ یہ موقع ان کے عظیم کارناموں کی تفصیل کا نہیں ہے البتہ ان کے ایک شاہکار کو نظرانداز کرنا دشوار ہے ۔ میرا اشارہ عثمانیہ یونیورسٹی کی طرف ہے ۔ یہ میں نہیں کہتا کہ یہ تنہا انہیں کا کارنامہ تھا ۔ ان کی جرأت آمیز توجہ اور کوششوں سے یونیورسٹی عالم وجود میں آئی ۔ اس یونیورسٹی کی خصوصیت یہ تھی کہ پہلی مرتبہ مادری زبان ، ذریعہ تعلیم قرار دی گئی ۔ مسعود جنگ اپنے اس عقیدہ میں راسخ تھے کہ جب تک تعلیم مادری زبان میں نہ ہو ، اپنے وسیع مفہوم میں قوم کے حق میں مفید اور نتیجہ خیز نہیں ہوسکتی ۔ یونیورسٹی کی کامیابی کا ایک بین ثبوت یہ ہے کہ انگلستان کی اور دوسری بین الاقوامی یونیورسٹیوں نے بھی اسے بخوشی اور بلا تامل تسلیم کر لیا ۔ مسعود جنگ حیدرآباد کے قیام کے زمانے میں دو مرتبہ جاپان گئے ۔ ان کے ہم سفر ایک مرتبہ بھائی سجاد مرزا تھے ۔ مسعود جنگ نے اپنے سفر کے تاثرات ایک تقریر میں ظاہر کئے جو بنام "روح جاپان" بعد میں طبع و شائع ہوئی ۔ مسعود جنگ جاپان کے قدرتی مناظر اور فنون لطیفہ کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے ۔ خاص طور پر جو بات انہوں نے محسوس کی وہ جاپانیوں کی جسمانی اور تمدنی

یکسانیت تھی۔ اخلاق، شائستگی اور لباس کی ستھرائی ہرطبقے میں پائی۔ اس بات سے بھی بےحد متاثر ہوئے کہ یہی ایک مشرقی قوم ایسی ہے جو دوستانہ تعلقات، مساوات کے اصول پر مغربی اقوام سے رکھتی ہے۔ ان کی تحقیقات میں جاپان کی حیرت ناک ترقی کا یہ راز تھا کہ ان میں نظم وضبط کی صفت، محنت کا مادہ اور وطن کی محبت بدرجہٗ اتم ہے۔ مسعود جنگ کو اپنے ملک کی تہذیب پر فخر تھا۔ نیز ہندوستان کے سچے سپوت کی حیثیت سے اس بات پر بھی ناز تھا کہ مسلمانوں نے ہندوستان کی تہذیب و شائستگی میں نہایت اہم حصہ لیا ہے، جس سے ہندوستان کو فی الجملہ بہت سے فوائد حاصل ہوئے۔

بالآخر قوم کی دعوت پر حیدرآباد سے رخصت ہوکر علی گڑھ چلے گئے۔ ان کے موروثی جذبہٗ ایثار نے اس پر آمادہ کیا کہ آرام کی زندگی چھوڑ کر بلامعاوضہ یونیورسٹی کی اصلاح کا کٹھن کام اپنے ذمے لیں۔ اس کام کو انھوں نے بحسن و خوبی انجام دیا اور یونیورسٹی کو قابل رشک بنا دیا۔

والیٔ بھوپال نواب حمیداللہ خاں نے جو بڑے صاحب فراست انسان تھے مسعود جنگ کی خدمات بحیثیت مشیر حاصل کیں۔ میں بھوپال ملنے گیا تھا اور افسوس کہ یہ مسعود جنگ سے میری آخری ملاقات تھی۔ مسعود جنگ علم کی دل و جان سے قدر کرتے تھے۔ مطالعے کا بےحد شوق تھا۔ وہ انسان دوست تھے - خوش مزاجی کے ساتھ سنجیدگی تھی۔ سادگی و بے تکلفی کے ساتھ وقار تھا۔ نرم مزاجی کمزوری کی حد تک تھی۔ مگر بعض اصولوں کے سختی سے پابند تھے۔ گفتگو دلکش اور قوت حافظہ ورثے میں پائی تھی۔ مزے مزے کے قصے، لطیفے اور عالمانہ نکات بیان کرتے تھے۔ ہزاروں اشعار اردو، فارسی، انگریزی اور فرنچ کے برز بان تھے اور کمال یہ تھا کہ ایک ہی مضمون کا ہر زبان کا ایک ایک شعر سناتے تھے جس سے لطف دو بالا ہوجاتا تھا۔ مسعود جنگ کی صحبت میں اٹھنے بیٹھنے والوں میں میرے بزرگ دوست ڈاکٹر غلام یزدانی(۱) نامور ماہر علم آثار قدیمہ بھی تھے جن کی عالمانہ نقادی، لطف صحبت میں چاشنی کا کام کرتی تھی۔ ایک بات بیان کرنے کے قابل ہے کہ مسعود جنگ بڑے خوددار آدمی تھے۔ بڑے بڑے حکام اور اکابر انگریزوں سے برابری کے درجے پر ملتے تھے۔ انگریز رزیڈنٹ جو ریاستوں میں فرعون بنا رہتا تھا مسعود جنگ اس کو بھی خاطر میں نہ لاتے تھے۔ اپنی لیاقت، کردار اور خدمات کی بنا پر مسعود جنگ ان ممتاز شخصیتوں کے زمرے میں ہیں جن پر اقبال کا یہ شعر صادق آتا ہے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بےنوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اکثر ڈاکٹر غلام یزدانی، ہارون خاں اور بھائی سجاد مرزا کی صحبت میں اب بھی مسعود جنگ کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔ چند لمحوں کے لئے عالم خیال میں ملاقات کا مزہ آجاتا ہے۔ میں اپنے مرحوم دوست کے اس تذکرے کو اپنے حسب حال اس شعر پر ختم کرتا ہوں:

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

(۱) غلام یزدانی صاحب کا ایک ماہ قبل حیدرآباد میں انتقال ہوگیا۔ (ادارہ)

شعبۂ لغت

اشتقاقیات

ڈاکٹر شوکت سبزواری

اُب ۔ عموماً اسے "ا" (=یہ) اور "ب" سے مرکب سمجھا جاتا ہے ۔ لیکن یہ امر شبہ سے بالا تر ہے جیسا کہ پلیٹس نے (ہندوستانی گرامر، ۱۸۳) لکھا بھی ہے کہ یہ لفظ اہل اردو کا وضع کردہ نہیں ، قدیم ہند آریائی یا درمیانی عہد کی پراکرت سے لیا گیا ہے ۔ یہ پیش نظر رہے کہ جب ، تب وغیرہ کی طرح جو قدیم اردو میں " جو " اور " تو " تھے ، (سب رس (صفحہ۱۰۶) میں ہے، "جو لگن (=جب تک) بشریت اس میں باقی ہے تو لگن (= تب تک) اناالله کہنے کی مشتاقی ہے")۔ اب کی "ب" اصلی نہیں "و" کا بدل ہے ۔ سوال یہ ہے کہ "و" کہاں سے آیا اور اس کے کیا معنی ہیں؟ پلیٹس اسے سنسکرت یاوت (جب تک) اور تاوت (تب تک) کے " و " سے ماخوذ بتاتے ہیں ۔ ڈاکٹر ٹرنر (نیپالی ڈکشنری ، ۱۸) ڈاکٹر چٹر جی کے ہم نوا ہیں ۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ پراکرت ایووم اور سنسکرت ایوم (اے + و + م = اس طرح) سے لیا گیا ۔ میرے خیال میں سنسکرت لاحقہ وت (جس کے معنی ہیں رکھنے والا) کا اختصار بھی ہوسکتا ہے جس طرح او (= ا + و) میں ہے ۔

بہر حال جو صورت بھی ہو " اب " اصل آریائی زبان میں " اَو " تھا ۔ بعد میں زبان کے عام صوتی رجحان کے زیر اثر " و " " ب " سے بدلا تو " اب " ہوگیا ۔

امیرمینائی نے شاید شیکسپیر وغیرہ کی تقلید میں " اذی " (آج) اس کا ماخذ بتایا ہے ، یہ درست نہیں ۔ اس لئے کہ " دی " کا بدل اردو میں "ب" نہیں " ج " ہے ۔

اُپاھا یہ قدیم لفظ ہے ۔ مصحفی کے یہاں حسرت اور آرزو کے معنوں میں استعمال ہوا ہے ۔ اردو کے کسی لغت میں نہیں ملا ۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ سنسکرت اُپ + ا + دھا سے وضع ہوا جس کے معنی ہیں ، اعتماد کرنا ، سہارا لینا ۔

اُپج کے اصلی معنی ہیں اُگنا ، زمین سے نمو پانا ۔ سنسکرت زبان کا اُپ جَ (اُپ = سابقہ + جَ = پیدا شدہ) یا اُپ جن (اُپ + جَن = پیدا ہونا) معنی اور بناوٹ دونوں اعتبار سے اس سے زیادہ قریب ہے ۔ شاید اس لئے شیکسپیر، فیلن، پلیٹس، شیام سندر داس (مصنف شبد ساگر) قریب قریب سب ہی

نے آپج کا ماخذ سنسکرت " آپ جن "(یا آپ ج) قرار دیا اور اسیر و نیّر نے ان کی تقلید کی۔ لیکن ان بزرگوں کا یہ خیال اس بنا پر قرین قیاس معلوم نہیں ہوتا کہ یہ لفظ اردو میں قدیم سے مستعمل ہے۔ راست سنسکرت سے ماخوذ نہیں ہوسکتا اور اگر پراکرت سے لیا گیا ہے تو زبان کے صوتی رجحان کے زیر اثر اس کا آخری حرف صحیح (ج) گرجانا چاہئے۔ اس لئے میں نے اس عام خیال سے اختلاف کرتے ہوئے اسے سنسکرت اُت پدّی (اُد + پدی) سے نکالا۔

پلیٹس کے لغت کی اشاعت ۱۹۶۰ کے آخر میں ایک ضمیمہ شامل ہے۔ اس میں اپج کو پراکرت اُپ پج (سنسکرت اُد پدی = پیدا ہونا) ہی سے مشتق بتایا گیا ہے۔ ڈاکٹر ڈیوڈ کی پالی ڈکشنری میں اس کی ایک شکل " اُپجّ " ہے (س: اد + پد = پیدا ہونا) اس سے بھی اس قیاس کی تائید ہوتی ہے۔

اَتّو - یہ فارسی میں بھی ہے اور اردو میں بھی۔ پہلی دو زبانوں میں " ت " کی تخفیف کے ساتھ ، اردو میں " ت " کی تشدید بھی صحیح ہے اور تخفیف بھی۔ اس کے اصلی معنی ہیں ، گھیرے نقش اور دھاریاں جو کپڑے پر لوہے کے دھار والے آلے سے ڈالی جائیں۔

ڈاکٹر معین دھخدا کی ہم نوائی میں روسی (UTIŪK) سے ماخوذ بتاتے ہیں۔ ڈاکٹر ٹرنر کا خیال ہے کہ یہ پالی اور پراکرت آت تت (س: آت تپت = گرم) سے وضع ہوکر، مرہٹی میں آیا، مرہٹی سے اردو میں ، اردو سے فارسی میں اور فارسی سے ترکی میں۔

اُردابیگنی ترکی زبان کا لفظ ہے۔ اُردا (اردو) = شاہی محل ، بیگ = سردار اور اردو علامت تانیث " نی " کی ترکیب سے بنا ہے۔ اس لفظ کے ترکیبی معنی ہوئے شاہی محل کی سردارنی۔

آتون - آتون کے معنی ہیں معلمہ اور استانی۔ یہ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں ہے۔ ڈاکٹر محمد معین (استاد تہران یونیورسٹی) اسے ھز وارش اَتونتن (پہلوی دوختن) کا بگاڑ بتاتے ہیں (برہان قاطع جلد ۱ ص ۱۸) لیکن صحیح بات یہ ہے کہ یہ ترکی خاتون (= شریف عورت) کی ایک شکل ہے۔ ترکی میں "خ" کا بدل " ہ " بھی ہے اور "ا" بھی۔

تبصرے

گل کرائسٹ اور اس کا عہد

طبع اول ۱۹۶۰ء

مولفہ

محمد عتیق صدیقی

مطبوعہ

یونین پرنٹنگ پریس ۔ دہلی

ناشر

انجمن ترقی اردو ہند

صفحات ۳۱۲

قیمت سات روپے

فورٹ ولیم کالج کے ساتھ گلکرائسٹ کا نام اردو دنیا میں یادگار ہے جو اردو زبان کے محسنوں میں تھا۔ گلکرائسٹ اور فورٹ ولیم کالج کے مصنفین اور ان کی تصنیفات و تالیفات کے متعلق میر حسن ایم ۔ اے نے اپنی تالیف "مغربی تصانیف کے اردو تراجم " (۱۹۳۹ء) میں دوتین صفحات وقف کئے ہیں ۔ مولوی سید محمد ایم اے ، بھی اپنی کتاب "ارباب نثر اردو" متعلق فورٹ ولیم کالج میں کافی بحث کرچکے ہیں۔ مسٹر سکسینہ نے بھی اپنی "تاریخ ادب اردو" میں فورٹ ولیم کالج کے مصنفین اور تالیفات کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔

محمد عتیق صدیقی صاحب نے گلکرائسٹ کے اردو کارناموں کے متعلق اپنی اس کتاب میں خاصی چھان بین سے کام لیا ہے ۔ کالج کے ریکارڈ سے بھی استفادہ کیا ہے ۔ لیکن ابھی اس میں مزید تحقیق کی ضرورت باقی ہے۔ غالباً کالج کا مکمل ریکارڈ تو انڈیا آفس لائبریری میں ہے۔ اس سے متعلق ایک فہرست کتب خانہ آصفیہ ، حیدرآباد میں ہماری نظر سے گزری تھی جس میں فورٹ ولیم کالج کے ریکارڈ کی تفصیل تھی ۔ فورٹ ولیم کالج کا اصل مقصد اپنے یوروپین عہدہ داروں کو، جن کی تعداد محدود تھی اردو زبان سے واقف کرانا تھا کہ ان کو نظم و نسق ہندوستان میں مدد مل سکے ۔ اس سلسلے میں ہندوستانی مصنفین کو گلکرائسٹ نے ملازم رکھا اور حکومت کے تعاون اور خود گلکرائسٹ کی سعی بلیغ سے نثر کی بہت سی اچھی کتابیں ، چندھی سال میں منظر عام پر آگئیں اور جدید نثر اردو کی بنیاد پڑی اس میں سائینٹفک لٹریچر کا فقدان تھا اس کو بعد میں ہماری سائینٹفک سوسائیٹیوں نے پورا کیا جن میں آگرہ بک سوسائیٹی ، غازی آباد بک سوسائیٹی ، لکھنؤ بک سوسائیٹی، مجمع علم و ہنر مدراس ، جس کا بانی و مبانی ڈاکٹر ایڈورڈ بالفور ایک انگریز تھا ، شامل ہیں ۔

تالیف ہذا کا پیش لفظ پروفیسر ہمایون کبیر اور تعارف پروفیسر احتشام حسین نے کرایا ہے اور مؤلف

نے خود دیباچہ لکھا ہے ۔ اصل کتاب حسب ذیل عنوانات پر مشتمل ہے :

ابتدائیہ، یعنی ہماری تاریخ ادب میں گلکرائسٹ کا مقام، مستشرقین میں گلکرائسٹ کا مرتبہ ، غلطیہائے مضامین ، یعنی یہ بحث کہ گلکرائسٹ کالج کا پرنسپل تھا یا مدرس ۔ گلکرائسٹ کے عہد کی تالیفات وتراجم ۔ اس کے بعد پہلے حصے میں گلکرائسٹ کے عہد کا پس منظر ، ہندوستانی زبان کے پہلا لغت وغیرہ پر بحث ہے ۔ دوسرے حصے میں گلکرائسٹ کے ورودہند اور ملازمت کمپنی کی صحیح تاریخ اور اس کی تالیفات اور لغات کا ذکر ہے ۔ تیسرے حصے میں گلکرائسٹ کے مدرسے اور اساتذہ اور ان کی تنخواہوں کا اورچوتھے حصے میں گلکرائسٹ فورٹ ولیم کالج میں ، ولز لی اور کورٹ آف ڈائریکٹرز کے تصادم اور گلکرائسٹ کے مطبع ہندوستانی پر روشنی ڈالی گئی ہے ۔ آخر میں اشاریہ اور ماخذات کی فہرست بھی دی گئی ہے ۔

بحیثیت مجموعی فاضل مؤلف کی کوشش قابل تحسین ہے، مگر بعض لحاظ سے ابھی تشنہ معلوم ہوتی ہے ۔ فاضل مؤلف نے سرولیم جونز کے زمانے اور سال وفات کا تعین نہیں کیا ہے ۔ صفحہ ۳۱ پر اس موضوع پر بحث کی ہے کہ گلکرائسٹ فورٹ ولیم کالج کا پرنسپل تھا یا نہیں ۔ اس سلسلے میں ڈکشنری آف نیشنل بایوگرافی اور انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا کو بھی غیر مستند قرار دیا گیا ہے اور مضحکہ خیز بیان کیا گیا ہے ۔ مولف نے اپنے استدلال میں آرائش محفل مصنفہ شیرعلی افسوس (تالیف ۱۸۰۲ء) اور تھامس روبک کی تاریخ فورٹ ولیم کالج (۱۸۲۰ء) مطبوعہ کلکتہ کو پیش کیا ہے ۔ نیز گلکرائسٹ کی لغت مطبوعہ ۱۸۱۰ء بھی پیش کی ہے ۔ سوال یہ ہے کہ آخر ان مستند مؤلفین سے ایسی غلطی کیوں ہوئی ۔ ممکن ہے کہ گلکرائسٹ کچھ دنوں پرنسپل بھی رہا ہو، اگر نہ بھی رہا ہو تو وہ اس کالج کا روح رواں اور اپنے شعبے کا صدر تھا اور عتیق صاحب کی پیش کردہ تحریرات اور اسناد سے واضح ہے کہ گلکرائسٹ اپنی تجاویز متعلق تالیفات وطباعت وغیرہ کو کونسل میں پیش کرتا تھا جس میں پرنسپل کے توسط یا منظوری کا ذکر نہیں اور راست گلکرائسٹ کو مخاطب کیا جاتا تھا ۔ البتہ ۱۸۰۲ء میں انگلستان جاتے وقت آس نے خودکو ہندوستانی زبان کا پروفیسر ظاہر کیا ہے اورکونسل نے اس کی خدمات کا اعتراف کیا ہے ۔

فاضل مؤلف نے مطبوعہ و غیر مطبوعہ کتب کی فہرست درج کی ہے جس سے واضح ہے کہ ساٹھ کتابوں کے منجملہ کچھ شائع ہوئی ہیں اور بعض زیر طبع تھیں مگروہ کتابیں بالآخر زمانہٗ مابعد میں طبع و شائع ہوئیں اور کئی طبع نہ ہوسکیں ۔ ان کا وجود بھی ہے یا نہیں ، اس کی کوئی صراحت نہیں کی گئی ۔ چنانچہ حیدر بخش حیدری کی "ہفت پیکر" اور "تاریخ نادری" وغیرہ کا اس میں کوئی حوالہ نہیں ہے ۔ نیز "حسن اختلاط" کے مؤلف میرابوالقاسم کے متعلق لکھا ہے کہ وہ دیسی آدمی تھے، کلکتے میں مقیم تھے اور یہ ایک متفرق تالیف ہے ، جو اس خیال سے نمونے کے طور پر تیار کی گئی تھی کہ

اگر ان کی ہمت افزائی کی گئی تو اس طریقے کی کتابیں تیار کرسکتے ہیں۔ مگر اصل کتاب "حسن اختلاط" کے نسخے کتب خانۂ سالار جنگ اور کتب خانۂ آصفیہ حیدرآباد میں موجود ہیں جس میں مصنف نے اپنا نام ابوالقاسم سبزواری لکھا ہے اور مارکوئس آف وازلی اور گلکرائسٹ کی تعریف کی ہے جو مرشد آباد کی تباہی کے واقعات پر مبنی ہے اور اس کی زبان صاف و شیریں ہے۔

فاضل مؤلف نے صفحہ ۲۲۱ تا ۲۶۱، بیس صفحے میاں مسکین کے مرثیے کے لئے وقف کردئے ہیں۔ گلکرائسٹ کی یہ ہدایت کہ مسکین کے مراثی کا مطالعہ مبتدیوں کے لئے بےحد مفید ہے، کچھ سمجھ میں نہیں آتی۔

صفحہ ۹۷ پر لکھا ہے کہ گلکرائسٹ نے اپنی تالیف شیکسپیر کے اُردو ترجمے کے آخر میں ۳۱ صاحب دیوان شعراء کی فہرست درج کی ہے جس میں امیر خسرو اور ملک محمد جائسی، کو بھی اُردو کا صاحب دیوان شاعر قرار دیا ہے۔ نیز یہ رائے کہ جعفر زٹلی بھی ایک معیاری شاعر تھا، غور طلب ہے۔ صفحہ ۱۹۲ پر فہرست کتب مطبوعہ میں ایک کتاب نمبر ۱۷ کا نام "کائنات جو" خلیل علی خاں اشک کی تالیف کا ذکر کیا ہے اور صرف ہاشمی صاحب کے بیان پر اکتفا کیا ہے مگر اس کا صحیح نام کیا تھا، اس کی وضاحت نہیں ہوسکی۔

صفحہ ۲۰۳ تا ۲۳۲ پر مصنفین کے خود نوشت حالات اور وجۂ تصنیف آن کتابوں سے نقل کئے ہیں جو قبل ازیں تاریخ ادب میں آچکے ہیں مثلاً نوطرز مرصع، رانی کیتکی، وغیرہ۔ بہتر تھا کہ فاضل مصنف آن کتابوں کے نمونے اور کچھ حالات مصنفین پیش کرنے کی سعی بھی فرماتے جو منظر عام پر نہیں آئے ہیں۔

گلکرائسٹ کی نجی زندگی، اس کے خاندانی حالات اور ہندوستان سے واپس جانے کے بعد اس کے مشاغل اور سنہ وفات وغیرہ کا ذکر نہیں کیا۔ اس کی صراحت تاریخ ادب اُردو سکسینہ میں موجود ہے کہ گلکرائسٹ کا انتقال ۱۸۲۱ء میں بہ مقام پیرس ہوا۔

ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ گلکرائسٹ نے اس بات کا تجربہ اور کوشش کی تھی کہ رومن رسم الخط اور ناگری رسم الخط اختیار کیا جائے اور عربی فارسی الفاظ کم کردیئے جائیں، چنانچہ للولال کوی نے اپنی ایک کتاب سے عربی اور فارسی الفاظ بالکل خارج کردئے۔ صفحہ ۲۹۸ پر گلکرائسٹ کے ایک رسالے رسم الخط اور اعراب کا خلاصہ دیا ہے۔ فاضل مؤلف اگر اس پر تنقیدی نظر ڈالتے تو اچھا ہوتا کیونکہ یہ مسئلہ آج کل معرکۂ بحث بنا ہوا ہے۔

بحیثیت مجموعی محمد عتیق صدیقی صاحب کی کوشش لائق تعریف ہے جنہوں نے فورٹ ولیم کالج اور گلکرائسٹ سے متعلق بہت سا نیا مواد پیش کیا ہے جو ابھی تک منظر عام پر نہیں آیا تھا۔

س-م

تذکرۂ علمائے ہند

مولفہ

مولوی رحمن علی

مرتبہ و مترجمہ

محمد ایوب قادری

مع مقدمہ

از

ڈاکٹر معین الحق

پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، کراچی - ۵

۲۰۸ صفحات قیمت ۱۵ روپے

برصغیر پاک و ہند میں علما کے جو تذکرے اس وقت تک لکھے جاچکے ہیں ان میں اولیت علامہ غلام علی آزاد بلگرامی کے تذکرے مآثرالکرام کو حاصل ہے، جو ہند و پاک کے جلیل القدر شیوخ اور علما کا تذکرہ ہے ۔ اس کے بعد علما کے اور تذکرے لکھے گئے، مگر عموماً یہ تذکرے مقامی علما کے حالات پر مشتمل ہیں ۔ اگرچہ ان کی افادیت مسلم ہے مگر ان کو وہ جامعیت حاصل نہیں کہ جن کو پاک وہند کے علما کا ایک جامع تذکرہ کہا جاسکے ۔

ایک جامع تذکرے کی ضرورت سب سے پہلے مولوی رحمان علی نے محسوس کی ۔ انھوں نے اس کتاب کو فارسی میں ۱۸۸۷ء میں لکھنا شروع کیا، اور ۱۸۹۰ء میں اس کو مکمل کرلیا، جو تذکرہ علمائے ہند کے نام سے موسوم ہے ۔ اگرچہ مولوی رحمان علی کی اور بھی متعدد تصانیف کا ہمیں پتا چلتا ہے لیکن ان کی تصانیف میں جو شہرت و مقبولیت علمائے ہند کو حاصل ہوئی ، وہ ان کی دوسری کتابوں کو میسر نہ آسکی ۔ اس کتاب میں فاضل مولف نے ۳۹ کتابوں سے مدد لی ہے اور بڑی حدتک پاک و ہند کے مشاہیر علما کے حالات کو یکجا جمع کر دیا ہے ۔ اگرچہ اس کتاب میں ہمیں پنجاب ، دکن ، وسط ہند ، بنگال اور مدراس کے علما کے متعلق کوئی مواد نہیں ملتا ، اور فاضل مولف نے اپنے دور کے بعض جلیل القدر علما کو بھی چھوڑ دیا ہے ۔ لیکن پھر بھی اس تذکرے کی افادیت اور اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ۔ اس کتاب میں ۶۲۹ علما کے حالات لکھے گئے ہیں اور آخر میں تکملہ میں بھی بعض علما کا ذکر ہے ۔ علمائے ہند کا پہلا ایڈیشن ۱۸۹۰ء میں نول کشور لکھنؤ سے شائع ہوا تھا ۔ پھر اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۱۴ء میں شائع ہوا جو اب نادر و نایاب ہو چکا ہے ۔ ہمارے ملک کے مشہور علمی ادارے پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی نے اس کتاب کی قدر و قیمت کر محسوس کیا اور اس کی افادیت کو زیادہ سے زیادہ عام کرنے کے لئے اس کے ترجمے ، ترتیب اور توضیح کا کام ملک کے مایہ ناز نوجوان محمد ایوب صاحب قادری ایم ۔ اے ۔ کے سپرد کیا ۔ یہ ترجمہ اس وقت ہمارے سامنے ہے ۔ محمد ایوب صاحب قادری نے اصل متن کے ترجمے میں احتیاط سے کام لیا ہے ۔ حواشی، ترتیب اور تعلیقات کے سلسلے میں بھی خاطر خواہ چھان بین کی ہے اور پاک و ہند کی لائبریریوں سے استفادہ کیا ہے ۔ انھوں نے تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے ہر بزرگ کے حالات کے حواشی میں اس کا اہتمام کیا ہے کہ ان بزرگ کے مفصل حالات جن کتابوں میں مل سکتے ہیں، ان تمام کتابوں کی تفصیل دے دی ہے، اور

جہاں کہیں متن میں ابہام و اجمال کو محسوس کیا ہے وہیں حواشی میں انکی توضیح کردی ہے۔ ہمارے قدیم مشرقی مصنفین عموماً واقعات و ولادت و وفات کے سلسلے میں سنہ ہجری لکھتے ہیں جس کی وجہ سے عہد حاضر کے محققین اور مغربی اسکالروں کو ان واقعات کا سنہ عیسوی نکالنے میں بڑا وقت صرف کرنا پڑتا ہے۔ اس کتاب میں بھی ہر جگہ سنہ ہجری کا اندراج کیا گیا تھا۔ فاضل مترجم نے سنہ ہجری کے ساتھ سنہ عیسوی کا بالالتزام اہتمام کیا ہے اور اس طرح تحقیقی کام کرنے والوں کو سنین کی مطابقت میں وقت کی اضاعت سے بچا لیا ہے۔ اسی طرح حواشی میں ۲۴ علماء و مشاہیر کے حالات کا مزید اضافہ کر کے اس کتاب کی معنوی خوبیوں میں اور اضافہ کر دیا ہے۔ کتاب کے آخر میں کتابیات اور اشاریہ بھی شامل ہے۔ اگر ترجمے میں شگفتگی اور انشا کی خوبیوں کی طرف اور زیادہ توجہ دی جاتی تو ہمارے خیال میں ترجمہ کا حسن نکھر جاتا۔

کتاب کی قیمت اس کی خوبیوں کو دیکھتے ہوئے زیادہ نہیں۔

ا۔ح۔ق

اردو نامہ

ہندوستان میں حاصل کرنے کا پتہ

ہندوستان میں "اردو نامہ" کے شائقین

رائٹرس امپوریم پرائیوٹ لمیٹڈ

خورشید بلڈنگ، فیروز شاہ مہتا روڈ، بمبئی۔۱

سے

رجوع کریں

یا براہ راست دفتر اردو نامہ اردو منزل، جمشید روڈ کراچی کو چندہ ارسال فرمائیں

مراسلات

عبدالماجد دریابادی
محمد سلیم
سید قدرت نقوی
سید ذاکر علی

اردو نامہ کا تازہ شمارہ (نمبر ۱۰) موصول ہوا ۔ نمونۂ لغت میں ص۶۴ ک ا میں اکابر و مشاہیر ادب کے ساتھ ایک اصغرالاصاغر کا حوالہ دیکھ، حیرت و ندامت دونوں سے گڑ گیا۔ یہ کیا کیا آپ لوگوں نے ۔ خواہ مخواہ اپنی کتاب کا معیار استناد گرا دیا ۔ اب

خو گر حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے

ص ۶۲ و ص ۶۳ ۔ "ابلیس. . . . آدم کی پیدائش سے پہلے عبادت و ریاضت کی بدولت فرشتوں کے زمرے میں شامل اور ان کا معلم ہوگیا تھا ۔"

یہ ساری عبارت بالکل بے سند اور محض عوام کے عامیانہ عقیدے کی ترجمان ہے ۔ ابلیس حسب تصریح قرآن جن تھا (کان من الجن) اور جن ہی آخر تک رہا ۔ اس کا فرشتۂ مغضوب ہونا تمام تر مسیحی عقیدہ ہے ۔

ص ۷۵ ۔ ک ا ، ابے تبے ، کے ذیل میں کہیں یہ سہواً چھوٹ تو نہیں گیا ؟

ابے تبے کرنا:
تو تکار کرنا ۔ بدزبانی کرنا ۔ ڈانٹ ڈپٹ کرنا ۔
فقرہ ۔ اب تو آپ گالم گلوچ پر اتر آئے اور لگے ابے تبے کرنے۔

والسلام

دریا باد ضلع بارہ بنکی

عبدالماجد

. . . سیوستان (سیوھن) کے ایک ہندو "غلام سورام ولد مہتہ آنند رام" نے ۱۱۹۵ھ میں بھگوت گیتا کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا ہے۔ اس کا ایک باب اس نے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ یہ گویا اس وقت کی اردو نثر کا نمونہ ہے ۔ سندھ میں قدیم ترین کتاب ہے جو اردو نثر میں لکھی گئی ۔ مصنف اور کتاب کا حوالہ مجھے کسی کتاب میں نہ مل سکا ۔ مقالات الشعراءؑ ۱۱۷۴ھ کا مصنف بڑا ہی فاضل اور وسیع معلومات کا شخص ہے مگر اس نے بھی اپنے اس معاصر کو نظر انداز کر دیا ہے۔

کتاب چونکہ مذہبی ہے اور مترجم ہندو ہے اس لئے ہندی الفاظ کثیر ہیں ۔ تاہم اس وقت کی عام بول چال کا اندازہ ہوتا ہے ۔

ایک بات اور گزارش کرنا چاہتا ہوں ۔ بنارس میں کبیر کے مزار پر اس کی تصنیف کردہ چند کتب بھی رکھی ہوئی ہیں ۔ ان میں سے ایک کتاب کا نام " ریختی " ہے ۔

یہ اس لفظ کا شاید سب سے قدیم استعمال ہے ۔ کیا بورڈ ان کتابوں خصوصاً " ریختی " کی نقل حاصل کر سکتا ہے ؟

میں نجارہ ، ریاست الور ، علاقہ میوات کا رہنے والا ہوں ۔ میرے خاندان میں بھی بعض قدیم کتب کا مجموعہ خاندان کے مختلف افراد کے پاس تھا ۔ ایک کتاب کا نام تھا " واقعات امامیہ ۔ " یہ سید غلام رسول ساکن ملاں واڑہ نجارہ کی تصنیف تھی ۔ محمد شاہی دور کی تصنیف تھی ۔ میواتی اردو کا بڑا اچھا اور جامع نمونہ ہے ۔ تین نسخے میں نے اس کتاب کے جمع کر لئے تھے ۔ کتاب ضخیم تھی لیکن قبل اس کے کہ میں کوئی کام کرتا ۱۹۴۷ ء کا ہنگامہ ہوگیا ۔ شہر تباہ ہوگیا کتابیں تباہ و تلف ہوگئیں ، بقیہ وہاں تھانہ میں جمع رہیں ۔ پھر کسی طرح مولانا ابوالکلام آزاد وزیر تعلیم ہند کو ان کتب کا علم ہوا ۔ چنانچہ انہوں نے وہاں سے وہ کتب دھلی منگوالیں ۔ شاید دھلی میں اس کتاب کا سراغ لگے ۔ اردو کے ارتقا میں ایک اہم کڑی یعنی میواتی اور ہریانوی اثرات معلوم کرنے کے لئے یہ واحد کتاب ہے ۔ کیا آپ کے اثرات وہاں تک ممتد ہیں ؟

شاہ ولی اللہ اورینٹل کالج ڈیپر — محمد سلیم

مکرمی ، زید مجد کم

. . . . مطلوبہ اسناد درج ذیل ہیں :-

حبش نے پھواں چیر سر پر لیا — ترک دیکھ پر نار سر تل کیا

(فتح نامہ نظام شاہ از شوقی)

بولیا نشان ہے عشق کی راوت کا قد ترا — بولی کہ فوج فتنہ اوچانے کی ڈھال بول

(غزل ، از نصرتی ۔ رسالہ اردو اکتوبر ۴۳۲

ویورپ میں دکھنی مخطوطات)

کہا یک ہرن نے زباں کھول کر — نبی سات وہ رمز وا بول کر

(ہدایت نامہ ضعیفی از اردو شہ پارے)

حبش کے ساتھ ترک کی مثال بھی ہے ۔ امید ہے کہ یہ مثالیں تدوین لغت میں کارآمد ثابت ہوں گی ۔

ملتان — سید قدرت نقوی

پانچ جزو اردو نامے کے وصول ہوئے ۔ میں نے اسی ہفتے میں شب و روز اس امر کی کوشش کی کہ جہاں جہاں شعر یا جملہ نہیں ہے ، اس جگہ کو پر کر دیا جائے لیکن بالکل ناکامیاب رہا ۔ میں نے اس بھروسے پر یہ وعدہ کر لیا تھا کہ میرے پاس کئی کتابیں قلمی اور مطبوعہ ایسی تھیں کہ جن کے مطالعے کے بعد مطلب برآری کی امید تھی۔ مثلاً تفسیر سورہ ٔ یوسف (اردو) مطبوعہ، ترجمہ (نظم) توراۃ وانجیل (قلمی) اور خزینۃاللغات وغیرہ وغیرہ ۔ مجھے ندامت اور افسوس ہے کہ ایک لفظ کی بھی خانہ پری نہ کر سکا۔ کہنا پڑتا ہے کہ کہاں ایک دریا اور کہاں ناچیز قطرہ۔ حق یہ ہے آپ کے ادارے کا مطالعہ بڑا وسیع مطالعہ ہے ۔ آپ کا کام آپ ہی کر سکتے ہیں ۔ مسودہ " اردو کہاوتیں " کے متعلق آپ نے ارقام فرمایا ہے کہ یہ مسودہ جن کتب سے مرتب کیا گیا ہے وہ سب ادارے میں موجود ہیں ۔ بےشک یہ سب کتابیں آپ کے دفتر میں ضرور ہوں گی ۔ لیکن ان ضرب الامثال کے متعلق جو جو فقرات و اشعار ہیں ، ان کا ماخذ اخبارات کے مزاحیہ کالم اور مراسلات جیسی مطبوعات ہیں ۔ بہر حال کچھ بھی سہی۔ جب یہ آپ کے کام کی نہیں تو آپ سبط نبی صاحب یا شاہد صاحب کو سونپ دیجیے ۔

کراچی — سید ذاکر علی

اردو لغت کی مجمل اشاعت

اردو لغت کے سابقہ اجزا " اردو نامہ " کے ساتھ ساتھ قسط وار چھپتے رہے ہیں ، چار آنے فی جزو کے شرح سے طلب کئے جاسکتے ہیں ۔ جو اصحاب مکمل اجزا محفوظ رکھنا چاہیں ، جلد طلب فرمائیں ۔

اردو نامہ کے سابقہ شمارے نمبر ۱ ، ۷ ، ۸ اور ۱۱ نایاب ہیں ۔ لہذا مہیا نہیں کئے جاسکتے ، البتہ لغت کے اجزا جو ان شماروں کے ساتھ شائع ہوئے تھے ، اب بھی دفتر سے مل سکتے ہیں ۔

مینجر

نگار (پاکستان) کا سالنامہ ۶۳ء

نیاز نمبر

جس میں ہند و پاکستان کے ۶۰ ادیبوں اور نقادوں نے حصہ لیا ہے

اور خود حضرت نیاز نے اپنا سوانحی خاکہ پیش کیا ہے۔

مئی ۶۳ء کے پہلے ہفتہ میں شائع ہو رہا ہے۔

ضخامت ۳۲۰ صفحات

قیمت چار روپے

سالانہ چندہ دس روپے۔

پتا

دفتر نگار (پاکستان)

۳۲۔ گاندھی گارڈن مارکیٹ

کراچی

ترقیٔ اردو بورڈ کی مرتب کردہ چند مطبوعات

مرآۃالعروس ڈاکٹر مولوی نذیر احمد مرحوم مع مقدمہ و فرہنگ

مرتبہ

جناب ڈاکٹر بیگم شائستہ اکرام اللہ

ناشر ویسٹ پاک پبلشنگ کمپنی ، لاہور قیمت ۳ روپے

منتخب الحکایات ڈاکٹر مولوی نذیر احمد مرحوم مع مقدمہ وفرہنگ

مرتبہ

جناب شاہد احمد دہلوی

ناشر ملک دین محمد اینڈ سنز ، لاہور قیمت ۲ روپے ۶۲ پیسے

منازل السائرہ مصنفہ علامہ راشدالخیری مرحوم مع مقدمہ و فرہنگ

مرتبہ

جناب رازق الخیری

ناشر جنرل پبلشنگ ہاؤس، بندو روڈ۔کراچی قیمت ۵ روپے

رسوم دہلی مصنفہ مولوی سید احمد دہلوی مع مقدمہ وفرہنگ
(مولف فرہنگ آصفیہ)

مرتبہ

سید یوسف بخاری دہلوی

ناشر اردو اکیڈمی سندھ ، کراچی قیمت ۶ روپے

نشاط انڈسٹریز لمیٹڈ

اعلیٰ ترین قسم کا سوتی دھاگہ بنانے والے

"کلفٹن بیچ" مارکہ

کارخانے :۔

ڈی ۔ (۵۰) سندھ انڈسٹریل ٹریڈنگ اسٹیٹ ، کراچی

ٹیلیفون نمبر (۷۹۱۰۴)

صدر دفتر :۔

بنک ہاؤس ، نمبر ۲ (چوتھی منزل)

حبیب اسکوئر ، بندر روڈ ، کراچی

ٹیلیفون نمبر : ۳۳۸۰۷ ، ۳۲۰۹۸

مینیجنگ ایجنٹس :۔

نشاط انٹرپرائزز لمیٹڈ

ترقیِ اُردو بورڈ
URDU DEVELOPMENT BOARD

ترقیِ اُردو بورڈ کی جامع ، تاریخی و تحقیقی

اُردو لغت

(مختصر، جلی نسخہ)

جلد اوّل : الفِ مقصورہ

(قسط نمبر ٦)

اُپاو (ضم ا ، سکن و) امذ (قدیم) رک: اپائے

نجھے قدرت میں سماو ہور قدرت میں آپاو۔

۱۵۸۲ کلمۃالحقائق ، حاتم ، ۴۱

تم بھی جو بہت سا اپاو کرتے تو بھی تمہارے ہاتھ نہ آتی۔

۱۸۰۵ سنگھاسن بتیسی ، ۳۹

اُپاھا (ضم ا) امث (قدیم)

ارمان ، تمنا ، امنگ

نکلے کسی صورت تو مرے دل کی اپاھا
معذور زیادہ تو نہیں جلوہ پناھا

۱۸۲۴ مصحفی (ق) ، ۲

[س . آپادھا = مقصد]

آپاہج (مت ا ، ہ) صف

۱ ۔ ہاتھ پاؤں سے معذور، لنجا، لنگڑا، لولا

اکثر ادھر کے لوگ کوڑھی، کلنگی، اپاہج، لولے لنگڑے... آتے، اس کے پھل کھاتے ۔ درست ہوکر چلے جاتے .

۱۸۱۲ گل مغفرت ، ۱۱۶

وھاں ایک عورت نابینا اور اپاہج لنجی ملی ... وہ عزیز کی لونڈی تھی ۔

۱۸۴۵ احوال‌الانبیا ، ۱: ۶۷۰

میں نے ایک لڑکے کو دیکھا کہ اس کے ماں باپ اپاہج تھے۔

۱۸۶۴ نصیحت کا کرن پھول ، ۸۸

مضطر تھے اپاہج ، ضعیفا کرتے تھے زاری

۱۸۷۴ انیس ، ۱. ۲۵

اپاہج جو تختے کی مدد سے حرکت کرے...شاھی محصول سے مستثنیٰ ہوں گے ۔

۱۹۱۳ تمدن ھند ، ۲۳۳

۲ ۔ نحیف، نزار ، کام کاج یا چلنے پھرنے کے ناقابل

اپاہج ہوکر اسی مسجد کی دیوار کے تلے جاپڑا۔

۱۸۰۲ باغ و بہار ، ۴۲

میرے اپاہج بچے ، میرا لنگڑا شوہر ، میری دکھی ہوئی آتما تجھ کو دعائیں دے رہے ہیں ۔

۱۹۱۸ جوہر قدامت ، ۸۷

۳ ۔ معذور ، مجبور

اس پر میں زبان کا اپاہج اس رنگ کے الفاظ کہاں سے لاؤں۔

۱۸۸۰ آب حیات ، ۸۶

اپاہج بیٹی ، بے ڈھنگی ماماؤں کے ہاتھ میں پڑا گھر ، جو کچھ ہو ٹھیک ۔

۱۹۰۸ صبح زندگی ، ۱۳۰

۴ ۔ بےعمل ، بے توفیق ، سست ، کاہل

عقیدۂ تقدیر نے ان کو مایوس اور اپاہج اور ازکار رفتہ کردیا ہے ۔

۱۹۰۶ الحقوق و الفرائض ، ۱: ۲۳

ہماری اصطلاح میں ہندوستانی شہزادہ ہر کاہل، مفت خور ، ہاتھ پاؤں والے اپاہج کو کہتے ہیں ۔

۱۹۲۷ اودھ پنچ ، ۱۲ ، ۲ : ۳

۵ ۔ مفلوج ، رہا ہوا ، ازکار رفتہ (عضو یا جسم)

تاکہ سارا دھڑ اپاہج ہوجائے۔

۱۹۰۲ ترجمۂ قران، نذیر ، ۶۷۹

٦ ـ محتاج، بے بس، بے سہارا

اب کون مرا زانو پہ سر لیوے گا مولا
اب کون اپاہج کی خبر لیوے گا مولا

١٨٧٥ مونس ، ٣ : ١٠

مسیح الملک کو لازم تھا کہ مظلوموں کی دادرسی کرتے لیکن انہوں نے ... اپاہجوں کی معافیاں بے دریغ ضبط کرلیں ۔

١٩١٢ بنات النعش ، ٦٦

میں بوڑھی اپاہج ہوں ، میرے کام کی سربراہی کرنے والا مظاہر تو ہی ہے ۔

١٩٢٣ انوارالاولیا، ٥٢١

اف : بننا ، ہونا ، کرنا

[س: اَپادھستی अपादहस्त्य ا (نفی) + پاد (پاؤں) + ھست (ہاتھ) + ی (صفت) = بے ہاتھ پاؤں والا]

ـــ پن/پنا امذ

١ ـ کسی عضو کے معطل ہو جانے کی وجہ سے معذوری

٢ ـ کاہلی ، سستی

اپاہج پن و مفت خوری کے نتائج سوا اس کے کیا ہوسکتے تھے کہ طبیعت ہر وقت بدچلنی پر آمادہ رہے ۔

١٩١٧ تاریخ اخلاق یورپ ، ١ : ٢١٩

[ار : اپاہج + پن (علامت مص)]

اَپاہجی (فت ا ، ہ ، ی مع) امث

١ ـ اعضا کی معذوری ، محتاجی ، کاہلی ، نکما پن

[ار : اپاہج + ی (مصدری)]

اُپاھے (ضم ا ، ی مج بکس) امث (قدیم) رک: آپاھا

نہیں نکسے ہے مرے دل کی آپاھے گاھے

١٨٢٢ مصحفی (ق)

اُپائی (ضم ا ، ی مع) امث

رک: ''آپ''

نگوں کی آپائی بڑی عمدہ ہوتی ہے ۔

(اصطلاحات پیشہوراں ، ٢ : ٤٩)

[ار : آپا (رک) + ئی (مصدری)]

اُپائے (ضم ا) امذ

تدبیر ، جتن ، منصوبہ

ایک بات جی میں بچاری ہے کہ اب میں یہاں سے جاؤں اور کچھ اُپائے کر تجھے بھی یہاں سے لے جاؤں ۔

١٨٠٥ سنگھاسن بتیسی، ٦٨

میں تو ایسے ایسے آپائے کر سکتا ہوں کہ آسمان سے پانی برسا دوں ۔

١٩٣٦ پریم چند، خاک پروانہ، ٣٧

اس ظلم کے بچنے کا نہیں کوئی آپائے
بیٹھے ہیں مگر چارہ‌گر اک آس لگائے

١٩٥٩ گل نغمہ، ٢٦٢

[س : آپائے उपाय (آپ + اِ = جانا)= ذریعہ، کوشش]

اَپ بھرنش (فت ا ، سکن پ ، فت بھ ، ر ، ن غنہ) امث

۱ ۔ تیسرے دور کی پراکرت (زبان) جس کا زمانہ ۶۰۰ سے ۱۰۰۰ ء تک قیاس کیا جاتا ہے ۔ اس کی تین بولیاں ہیں۔ وراچڈ، ناگر، آپ ناگر۔ برصغیر کی آریائی زبانیں براہ‌راست اپ بھرنش کی پیداوار ہیں ۔

جاننا چاہئے کہ ہماری زبان میں کثرت اپ بھرنش کے الفاظ کی ہے جو پراکرت سے تصرف کے ساتھ لئے گئے ہیں ۔

۱۹۵۰ کیفیہ ، ۲۹

۲ ۔ عام بول چال کی زبان ، عوامی بولی

[س : اَپ بھرنْش = ساقط ، خراب]

اُپَٹ (ضم ا ، فت پ) امث

سطح زمین کے اوپر کی تہ کی تڑقن جو پانی خشک ہونے کے بعد چکنی مٹی کی زمین پر پڑ جاتی ہے ۔ (اصطلاحات پیشہ‌وراں ، ٦ : ۴)

اف : آنا، پڑنا

[پا: اُپَتّ (وید: اُتْپَتّ ، اُد + پد) = ظہور ، نمود یا پا : آپ بتھ (س: آت پتھ، آد + پتھ) = غلط راستہ]

اُپْٹَن (ضم ا ، سکن پ ، فت ٹ) امذ

رک : اُبٹن

تیرے ماتھے پہ تھا چندن کا لگایا ٹیکا
اپسراؤں نے کیا تھا ترے رخ پر اُپٹن

۱۹۱۰ سرور جہان‌آبادی ، خمکدۂ سرور ، ۱۴۴

اَپ ٹو ڈیٹ (فت ا ، سکن پ ، و مع ، ی مج) صف

جدید وضع قطع رکھنے والا

صرف ایک خوبصورت ، رنگین مزاج، اپٹو ڈیٹ ، شیریں بیاں نوجوان دیکھا اور پھول اٹھیں ۔

۱۹۳۶ پریم چند ، پریم چالیسی ، ۲ : ۲۱

[انگ up-to-date = آج کی تاریخ تک، تاحال]

اُپْٹْنا (ضم ا ، فت پ ، سکن ٹ) ف ل (قدیم)

۱ ۔ اُمنڈنا ، جوش مارنا ، تیزی سے بہنا

ڈھلے تو انجو چک تی ہو سخت جوش
آساماں کا سینے تی اُپٹے خروش

۱۶۵۷ گلشن عشق ، ۸۰

۲ ۔ (مجازاً) غصہ کرنا، آپے سے باہر ہونا، بگڑنا، برس پڑنا

کہ غصہ سوں منج پر اُپٹتی ہے توں
کہ جلتے اُپر تیل سٹتی ہے توں

۱۶۰۹ قطب مشتری ، ۸۱

[پا : اُپٹّھ (س : اُپ + ستھا) = اٹھنا ، ظاہر ہونا]

اَپَج (فت ا ، پ) صف (عوام)

نہایت پاجی ، از حد کمینہ ، دون فطرت

سب کے سب گرگے اپج، دھے، دائرہ، جھانجھ بجتا ہوا ۔

۱۸۷۹ بوستان خیال ، ٦ : ۱۱۸

اپج

پاجی کیسے صاحب اپج کہئے .. بلکہ ہزار پاجیوں کے پاجی اپج کہئے۔

۱۸۸۷ سیر کہسار ، ۱: ۸۴

نہیں کوئی صاف سینہ، ہم ان میں بھی ہے کینہ
یہ انہیں کہیں کمینہ وہ انہیں کہیں اپج ہے

۱۹۲۱ اکبر ، ک ، ۱: ۲۱۲

بے سر و پا اعتراضوں اور نکتہ چینیوں کے جواب اگر دئے جائیں تو بقول سرسید مرحوم کے پاجی کو اپج بنانا ہے۔

۱۹۲۷ شاد ، فکر بلیغ ، ۶۸

[ا ر : پاجی کا اسم تفضیل بروزن اَفْعَل بقاعدہ عربی، غیرثقہ]

—الپوّاج (فت پ ، شد و) صف (عوام) **بہت بڑا پاجی ، پاجیوں کا پاجی ، پجوڑا**

بشیرالدولہ تو ایک نالائق پاجی آدمی ہے بلکہ پجوڑا آدمی، اپج الپواج۔

۱۸۸۷ سیر کہسار ، ۲: ۵۹۸

[ا ر : اپج + ع ۔ ا ل + پواج (بر وزن فَعّال بصیغہ مبالغہ = بڑا پاجی) بہ قاعدہ عربی، غیرثقہ]

اُپَج (ضم ا ، فت پ) امث ۔ **اوپج ، اپچ ، اوپچ**

۱ ۔ پیداوار ، حاصل (کھیتی کا)

داتی تو نہ جانے گا یو سچ ہے
گر کم اچھو یا ادک اپج ہے

۱۷۰۰ من لگن ، ۹۷

اتنے ہی کھیت تو ہمارے پاس بھی ہیں ، اتنی ہی اپج تو ہماری بھی ہے۔

۱۹۳۶ پریم چند ، گئو دان ، ۶۶

۲ ۔ (قدیم) (i) پیدائش ، وجود جسمانی

نہ ہووے تل اس طائراں کا اوپج
کہ پیدا کرے نہار بن کس سمج

۱۶۵۷ گلشن عشق، ۱۰۵

(ii) بعثت ، ورود، ظہور (نبی کا)

ہوا ہے جن امت میں تیری اپج
چھوڑا تاج اس کوں تجھ آخر ہے لج

۱۶۶۵ علی نامہ، ۱۲

۳ ۔ (مجازاً) عمر ، سن و سال

اپج میں دونو اپس دالے نہال
بڈھائے تھے سو محبت کی پال

۱۶۵۷ گلشن عشق ، ۲۰۵

۴ ۔ انوکھی بات، نرالاپن، جدت، اختراع

گوھوں احسا کے معنی جو چیر آگے
پر ہے یہ نئی اپج اپجنا کیسا

۱۸۱۸ انشا ، ک ، ۳۹۲

ذرا دیکھ کیا میری پیاری اپج ہے
تری کچھ نہیں میری ساری اپج ہے

۱۹۱۰ کلام مہر (سورج نرائن) ، ۱۵۸

یہ ڈاکٹر صاحب کی اپج تھی۔

۱۹۳۵ چند ہم عصر ، ۱۹۸

۵ ۔ جوش ، ابال ، امنگ

اپج سے دل کی از خود ناچتے ہوں مور چلا کر
جو مطلع صاف ہو ٹھنڈی ہوا چلتی ہو اٹھلا کر

۱۹۳۲ نظم طبا طبائی ، ۱۹۷

۶ ۔ (موسیقی) تان ، لے

بنسوازے کی اپج ایسی ہے لے گرما گرم
کہ بس اک آگ گئی سارے نیستاں ہے لپٹ

۱۸۱۸ انشا ، ک ، ۴۸

انھوں نے اپنے نغموں میں گٹکری ، اپج ، پلٹی تان کسی گوئے سے لےکر نہیں ڈالی ۔

۱۸۸۰ آب حیات ، ۱۱۱

سارنگو چھڑا ہے ہر سمت اک اپج ہے
لیکن ذرا سنو تو صف ہے یا گرح ہے

۱۹۲۱ گاندھی نامہ ، اکبر الہ آبادی ، ۳

[پ. اَپ + پَتّیِ ، س . اُت پَد یتے (اُد + پَد) = اگتا ہے یا پا اپجتِ (اُد + پَتّ) = وجود میں آتا ہے ۔]

۔۔کی سوجھنا (محاورہ) رک : اپج کی لینا

جہاں تان لیتے ہیں دل توڑتے ہیں
انہیں بھی اپج کی نئی سوجھتی ہے

۱۸۷۶ سحر ے مثال ، ۱۰۶

قرآن لوگوں کے دل میں جگہ کر لے گا تو ان کو اپج کی سوجھے گی .

۱۹۰۵ لیکچر نذیر احمد ، ۲: ۳۰۶

۔۔کا (صف) نیا ، اچھوتا ، جدید

خیالات ایسے چست اور اپج کے ہوں کہ نئی بات معلوم ہو۔

۱۹۴۴ افسانچے ، ۱۳

۔۔کی لینا ف ل ا ۔ انوکھی بات کہنا یا کرنا، جدت کا اظہار کرنا (اکثر طنزاً)

از زور لنت نئی اپج کی لی ہے
اس تان کے بیچ کا اپجا کیا خوب

۱۸۱۸ انشا ، ک ، ۲۹۱

کیوں نالہ و فریاد میں بھی لیں نہ اپج کی
خلقت ہے بنے عالم ایجاد ہماری

۱۸۷۰ الماس درخشاں، مہر، ۳۱۸

یہ اپج کی اچھی لی کہ پھر جنگلوں میں گھومو اور تباہ ہو۔

۱۹۰۳ خدائی فوجدار ، ۲: ۲۲۹

۲ ۔ دون کی لینا ، شیخی بگھارنا ، اتراتا

بہار میں نہ ہماری فغاں سنی افسوس
اپج کی ہم سے نہ مرغان خوش گو لیتے

۱۸۳۶ ریاض البحر ، ۲۰۰

پھر دل کو تسلی دیتا تھا ، اپج کی لیتا تھا ، کہتا تھا کہ یہ بیابان طلسم ہے . . پہلے مشقت و محنت کے سو مرحلے طے کرنا چاہئے۔

۱۸۹۹ بوستان خیال ، ۳: ۱۸۹

ایک دوست نے حالت نشہ میں یوں اپج کی لی ۔

۱۹۰۲ سرشار ، ہشو ، ۲۸

۳ ۔ جدت ، اختراع ، ایجاد سے کام لینا

پس بدون پریکٹیکل سائنس (حکمت عملی) کے ہرگز توقع نہیں کہ ہندوستانی اپج کی لیں ۔

۱۸۹۵ لکچر نذیر احمد ، ۱: ۷۱

لارڈ مارلے کا دماغ اس طرف لگا ہوا تھا کہ ہندوستانی ڈیڑھ اینٹ نے اپج کی لی اور اس کا ہاتھ بٹا دیا ۔

۱۹۲۷ عظمت اللہ خاں ، مضامین ، ۲: ۱۷۲

۴ ۔ نئی تانیں اڑانا

تو گانے بجانے کا آیا خیال
اپج کی لگا لینے ہر خوش جمال

۱۸۲۹ جلوۂ اختر ، بیخود ، ۱۲

ــــلینا ف ل ا ۔ جدت دکھانا ، نئی حرکت کرنا

تم جان نہ چھوڑوگے ، جینے نہ دوگے ، ہر دم ایک نئی اپج لوگے ۔

۱۸۳۵ نغمۂ عندلیب ، ۱۳۰

لگاوٹ میں بھی اکھڑی ان سے اک آفت کی لیتا ہے
اپج لیتا ہے جب یہ دل نئی صورت کی لیتا ہے

۱۹۰۵ یادگار داغ ، ۸۰

۲ ۔ (موسیقی) تان لینا ، الاپنا

دیکھنا جی کے حلاے کا مزہ گل چیں بھی
کوئی دیپک کی اپج مرغ خوش‌الحاں لیتا

۱۸۳۶ ریاض‌البحر ، ۴۴

اپج سر کی لے اے دل تار آار
بجا میرے آگے ذرا سر سنگھار

۱۸۵۹ حزن اختر ، ۱۱۳

ــــنکالنا ف ل انوکھی بات کرنا یا کہنا، نرالے پن کا اظہار کرنا

آپ نے ایک نئی اپج نکالی ہے کہ لڑکے تادیب سے خراب ہوجاتے ہیں ۔

۱۹۳۶ پریم چند ، واردات ، ۱۵

ــــہونا ف ل (قدیم)

نمودار ہونا ، نکلنا ، باہر آنا

تجے ڈر اپج شرزہ ہونا سکے
متیاهست هیبت تی سو ، نہ سکے

۱۶۵۷ گلشن عشق ، ۲۴

اُپَجانا (ضم ا) ف م **پیدا کرنا ، اگانا**

دَهن اُپجانے والوں کا راج
هَن برسانے والوں کا راج

۱۹۵۹ گل نغمہ ، ۲۹۶

اُپَجانہارا (ضم ا سکن ن) صف (قدیم)

خالق ، پیدا کرنے والا

قازاں میں کاری ، عمزیاں کوں اپجا نہاری ، پاتاں جیسیاں بپاتاں ۔

۱۶۴۳ سب رس ، ۲۰۷

[ار : اپجان (= اپجنا سے اسم مصدر) + ھارا (رک) علامت فاعل]

اَپَجَس (فت ا ، سکن پ ، فت ج) امذ

بے عزتی ، رسوائی ، بدنامی

کال میرے نکٹ آن پہنچا ہے ، اس سے اپجس کا مرنا بھلا نہیں ۔

۱۸۰۵ سنگھاسن بتیسی ، ۷۵

یہ جان کر کہ یہ تجویز پوری ہوکر رہے گی اس نے اس کے خلاف کر کے اپجس لینا مناسب نہ سمجھا ۔

۱۹۳۶ پریم چند ، بیوہ ، ۳۵

[س : اَپ یَ شَ س अपयश (اَپ = نفی + یش = عزت + س)]

اُپَجنا (ضم ا ، فت پ ، سکن ج) ف ل ۔ اوپجنا
اپجنا ، اوپجنا

۱ ـ اگنا ، پھوٹ نکلنا ، نشو و نما پانا

نہ ہر ایک بن میں چندن اپجتا ہے ، نہ ہر ایک ہاتھی کی مستک میں مکتا ہوتا ہے ۔

۱۸۰۲ بیتال پچیسی ، ۳۵

اس تان کے بیج کا اپجنا کیا خوب

۱۸۱۸ انشا ، ک، ۳۹۱

کھیت میں اپجے سب کوئی کھائے
گھر میں ہو تو گھر بہہ جائے

۱۸۶۸ رسوم ہند ، ۴۳

جس زمیں سے اپجا ہے ، اسی میں پھر سما جائے گا ۔

۱۹۱۴ راج دلاری ، ۱۷۲

وہ بیج جو امیر خسرو سے ۸۰ برس پہلے بویا گیا تھا ، اپج اپجا کر بے قرینہ پھیلا ہوا تھا ۔

۱۹۳۰ تاریخ نثر اردو ، ۱ : ۹

۲ ـ پیدا ہونا

اس گیان سوں گیان ہیں اپجتا

۱۷۰۰ من لگن ، ۵۲

ہمیشہ فتح نصیبی ہمیں نصیب رہی
جو کچھ کہ اپجے ہے جی میں سو مار رکھتے ہیں

۱۷۸۵ درد ، د، ۴۸

راجہ نے ڈنڈوت کر کہا کیا دکھ تمہارے من میں اپجا ہے، مجھ سے کہو۔

۱۸۰۵ سنگھاسن بتیسی ، ۶۳

۳ ـ جنم لینا ، تولد ہونا ، ظہور کرنا

یک لک اسی پیمبراں اپجے جگت میانے ولے
تج پر نبوت ختم ہے سب تھے تو نہی پیارا ہوا

۱۶۱۱ محمد قلی ، ک ، ۹

پرت بن عشق کئیں اپجتا نہیں
کہ مرنا و جیا سمجتا نہیں

۱۶۴۰ چندر بدن ، ۸۱

نعت ان سید کونین رسول الثقلین
جن اپجے میں پڑے ڈرسوں نتاں کفر کے ڈھل

۱۶۶۵ علی نامہ ، ۱۰

سچ ایسا نرالی بھی اپجیا ہے کتیں
ندی کے کنارے سوں پیاسا ہوں میں

۱۶۸۲ رضوان شاہ ، ۱۵۵

آدھر سنسار میں اپجے ہیں ادھر بنسی ہیں ۔

۱۸۰۵ سنگھاسن بتیسی ، ۲۷

۴ ـ دل میں نیا خیال آنا ، نئی بات یا امنگ پیدا ہونا

ہمیشہ فتح نصیبی ہمیں نصیب رہی
جو کچھ کہ اپجے ہے جی میں سو مار رکھتے ہیں

۱۷۸۵ درد ، د ، ۲۷

جی میں ہی رکھی اپنے میاں جی میں جو اپجی
کچھ ہم نے کہا تم سے تمنا کے دنوں میں

۱۸۲۴ مصحفی ، (ق)

۵ ـ ظاہر ہونا ، نمودار ہونا، طلوع ہونا، نکلنا ، برآمد ہونا

اوجالے کی ان کوں نہ تھی کچھ خبر
جو نس کاں اپجتی ہے ہور دن کدھر

۱۶۵۷ گلشن عشق ، ۱۰۵

غنچہ دل کا جب نہیں کھلتا تو نئیں ہوتی بہار
حسن تب اپجے ترا جب دل مرا خورسند ہو

۱۷۳۳ آبرو (ق) ، ۲۵

۶ ـ جوش میں آنا ، ابھرنا

شاہزادی نے واہ واہ جو کی
خوب پھولی پھلی نہت اپجی

۱۸۸۴ مثنوی عالم ، ۵۶

۷ ـ نکھرنا ، سنورنا ، فروغ پانا

سبزہ رنگوں کے ہوا حق میں یہ تب‌کرنا دوا
تیرگی جاتی رہی چھرے کی اور اپچی صفا

دیوان آبرو ، (ق)، ۳۵

۸ ـ تان اڑانا ، گانا

دائرہ اور چکارا بجتا ہے
لے سری ایک اک اپجتا ہے

۱۸۷۳ طلسم الفت ، قلق ، ۱۴

کوئی ٹپا کوئی ٹھمری اوپجتا ہے ۔

۱۸۸۳ فسانۂ عبرت ، ۷۶

اس وقت وہ راگ بج رہا تھا
کس قہر کا وہ اپج رہا تھا

۱۸۸۵ دریائے تعشق ، ۲۷

[ار : اپج (رک) + نا]

اَپِچ (فت ا ، کس پ) (قدیم) اَپْ (آپ) + ج (ھی) = آپ ھی

اپس سوں اپچ آج محرم ہوں میں
اپس سوں اپچ آج ہمدم ہوں میں

۱۶۰۹ قطب مشتری ، ۲۹

اُپَچ (ضم ا ، فت پ) امث ۔ رک : ''اپج''

لگی لینے اپچیں خوشی سے نئی
اڑانا لگا بجنے اور سگھڑئی

۱۷۸۵ سحرالبیان ، ۳۵

جہاں تان لیتے ہیں دل توڑتے ہیں
انھیں بھی اپچ کی نئی سوجھتی ہے

۱۸۷۶ سخن بے مثال ، ۱۰۶

حیالات ایسے چست اور اپچ کے ہوں کہ نئی بات معلوم ہو ۔

۱۹۴۴ افسانچے ، ۱۳

اُپْچار (ضم ا ، سکن پ) امث ۔ (قدیم)

چلن ، وضع ، طریقہ

یو ایک سوں دو ہے دو سوں دو لاکھ
اپچار جگت کی جان اے پاک

۱۷۰۰ من لگن ، ۵۸

[س : (اَپ + چار) = انتظام]

اُپْچانْہارا (ضم ا ، سکن پ ، ن) صف ۔

رک : ''اپچانہارا''

پیدا کرنے والا ، خالق

سخن دل میں اپچانھارا تُہیں
زبان پراوے لیا نہارا تُہیں

۱۶۵۷ گلشن عشق ، ۸

اُپْچاو (ضم ا ، پ ، ومع) صف

زرخیز ، قابل کاشت ، (زمین یا کھیت)

بھگوان نے کھر پور کی دھرتی بڑی اپچاؤ کی ہے ۔

۱۸۸۸ ابن‌الوقت ، ۶۸

[ار : اپج + اؤ (س : آک) = علامت فاعل]

اُپَچْنا (ضم ا ، فت پ ، سکن چ)

رک : اپجنا (جو فصیح ہے)

عقل دلالی کا اپچنا عقل مقیم میں تھے ہے ۔

۱۵۸۲ کلمۃ الحقائق ، جانم ، ۲۰

منح ایسا ذراسی بھی اپچیا ہے کتیں
ندی کے کنارے سوں پیاسا ہوں میں

۱۶۸۲ رضوان شاہ، ۱۵۵

پھر آم کے پیڑ سے یہ نبولی کیسے اپچی -

۱۹۱۴ راج دلاری ، ۲۱

اُپْچَنْہار (ضم ا ، سکز پ ، فت چ ، سکن ن) امذ

۱ - عمدہ زمین جس میں بیج جلد یا گھنگھنا کے پھوٹے یا ہر قسم کے بیج بونے کے لئے موزوں ہو۔

۲ - پھوٹنے والا بیج (ابیج کی ضد)

[ار : اپچن (اپچنا کا اسم مصدر) + ہار (رک) علامت فاعل]

اَپْچَھر (فت ا ، سکن پ ، فت چھ) امث (قدیم)

وک : " اپچھرا "

مورت ترنگ کی دیکھ کر اپچھر ہوئے گمنام سب
چنچل کی چپلائی نرکھ چپلا گگن میں جاڑے

۱۶۹۷ ک ، علی عادل شاہ ثانی ، ۵۴

ہر یک اپچھر پریاں دھن پر سندر ناریاں حوران دیکھت

۱۶۹۷ ہاشمی ، د ، ۱۱۸

اَپْچَھرا (فت ا، سکن پ، فت چھ) امذ نیز امث، ق:

اچھرا، اپچھری، اچھری (قدیم) رک: اپ سرا

۱ - پری ، اندر کے دربار کی رقاصہ

چلاؤں منتر گھم پھگرھم میں آ
اتاروں یتا اندر کے اپچھرا

۱۶۵۷ گلشن عشق ، ۸۴

اپچھرا اندر کی سوں تھی خوب تر
حسن اس کا تھا پری سوں بیش تر

۱۷۱۴ فائز دھلوی ، ۲۰۴

[س : اَپ سَ رَس अपसरस (اَپ = پانی + سَر = چلنا) یا : اَچھرا · अच्छरा]

اَپْچَھری (فت ا ، سکن پ ، فت چھ) امث (قدیم)

رک : " اپچھرا "

اے دنیا کے سرگ کی اپچھری اے گن وتی گن بھری -

۱۶۳۴ سب رس ، ۱۱۸

اُپَدْرو (ضم ا ، فت پ ، سکن د ، و مج) امذ

شور و غل ، غل غپاڑہ ، اودھم

بقولات کے کھانے والے ھندو دیکھو کیا اپدرو مچا رہے ہیں۔

۱۹۱۲ لیکچر نذیر احمد ، ۱۴۷

اف : اٹھانا ، ڈالنا ، کھڑا کرنا ، مچانا

[س : اُپدْرو]

اُپْدیش (ضم ا ، سکن پ ، ی مج ہکس) امذ

۱ - رائے ، مشورہ ، صلاح

تم میرا انتم اپدیش یاد رکھنا -

۱۹۲۱ پتنی پرتاپ ، ۹۲

ادھر سنگھم سے اٹھ کر مالوی اپدیش دیتے ہیں
کہ مٹ جائے گی جاتی گر نہ عامل ہوگی گیتا کی

۱۹۳۷ بہارستان ، ۴۷۶

اب اس قسم کے اپدیش ، بے نتیجہ سیاسی مشورے اور فاقے کام نہیں آتے ۔

۱۹۶۱ اردوئے مصفیٰ ، ۹

۲ ۔ نصیحت ، وعظ ، تلقین

دور آنکھوں سے ہماری پردہ‌ٔ پندار کر
گیان کا اپدیش دے اور دھرم کا پرچار کر

۱۹۱۰ کلام مہر ، ۲ : ۱۷۲

کرشن جی نے اپنے بھلے چیلے ارجن کو اپدیش دئے ۔

۱۹۱۲ سی‌پارۂ دل ، ۱ : ۱۸۸

اپدیش چھوڑ کر آپ یہاں کہاں ٹپک پڑے ۔

۱۹۳۵ پہلا پیار ، ۳۴

اف : دینا

[س : آپ + دیش]

اُپدیشَک (ضم ا ، سکن پ ، ی مج ، فت ش) صف

ناصح ، واعظ ، مبلغ

اقبال بڑا اپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا یہ غازی تو بنا کردار کا غازی بن نہ سکا

۱۹۲۴ بانگ درا ، ۲۳۶

[س : اپدیش + ک = علامت فاعل]

اَپَر (فت ا ، پ) (غریب)

(الف) صف

۱ ۔ بلند، اعلیٰ ۔ (انگریزی مرکبات میں)

چوتھی جماعت اپر پرائمری مکان کے باہر کے حصے میں بیٹھتی تھی ۔

۱۹۳۸ فرحت ، مضامین ، ۲ : ۱۹۹

۲ ۔ بالائی ، شمالی ، سمندر کے مخالف سمت کا

اپر سندھ اور میرپور بلا تقسیم ایک سردار کی حکومت میں رہا کیا ۔

۱۸۶۹ عہد نامجات ، ۷ : ۴

(ب) امذ

(ہونے کا) اوپر کا حصہ (تلے کا مقابل)

[انگ : upper (up + er) = مقابلۃً اونچا]

اُپَر (ضم ا ، فت پ) اوپر (قدیم)

الف ۔ حرف جر رک : ”پر“

راجا ہے تو پٹ اپر بھی گیان
پرجا ہے تو کھٹ اپر بھی گیان

۱۵۰۰ من لگن ، ۵۲

جس گود اپر پانوں رکھیں تیرے رسولاں
اس گود کوں میں کحل کروں دیدۂ جاں کا

۱۷۰۷ ولی ، ک ، ۳

اور اس کے ہودج زریں اپر جناب نواب
ہے جیسے ابر سیہ بیچ مہر پر انوار

۱۷۹۷ نوطرز مرصع ، ۶۲

ہے جائے ہر دل میں تری آدو گزر کر بے وفا
کر رحم ٹک اپنے اپر مت ہو دل آزار اس قدر

۱۸۱۰ میر ، ک ، ۱۷۹

(ب) امذ ۔ رک ۔ ”اوپر“

بادل ہے سفرے کے اپر جوڑے جنت کیاں نعمتاں
سو اس کندوری کوں دیکھت ترلوک سب حیران ہے

۱۶۱۱ قلی قطب ، ک ، ۱۲۲

حو کرتے ہیں چھتری کے اپر ناز کبوتر

۱۸۳۰ نظیر ، ک ، ۸۶

(ج) مف

۱ ۔ رک : '' اوپر ''

حکچھ ہے سو وہ نج تے پیدا اہے
اپر ہور نلیں سب ہویدا اہے

۱۶۳۹ خاور نامہ ، ۴

۲ ۔ بڑھ کر، زیادہ، آگے، متجاوز، مزید براں

ہزار ہور سو نیس تھے دو اپر
محمد کی ہجرت کوں سن کان دھر

۱۷۱۹ جنگ نامہ عالم علی خاں ، ۶۷

[پا: اُپرِ ، ویہ : اَپَر (اُپ + ر) قب: لاط: S-uper
گوتھ : ufar جر : Über انگ : over]

ـــآنا (محاورہ) (قدیم)

نکل آنا ، نمایاں ہونا ، ابھر آنا

سودھن کے دو کچ ہر گھر چھانے ہیں
کہ پھراں پر تاوے اُپر آئے ہیں

۱۶۰۹ قطب مشتری ، ۹۶

اَپْراد (اَپرادھ) (فت ا ، سکن پ) امذ

۱ ۔ قصور ، کوتاہی ، جرم

بڑا اپرادھ ہوا اور میں نے تمہارا مرم نہ جانا۔

۱۸۰۵ سنگھاسن بتیسی ، ۴۴

سچ ہے جو کچھ برادری کا اپراد ہوا ہے ، نادانی میں ہوا ہے۔

۱۹۳۶ پریم چند ، پریم پچیسی ، ۲ : ۱۴

۲ ۔ الزام ، اتہام

لوگ چوری کا اپرادھ لگائیں گے ، نہیں مجھے یہ ہار نہ چاہئے۔

۱۹۳۶ پریم چند ، خاک پروانہ ، ۳۰

[س : اپرادھ (اَپ + رادھ)]

اَپْرادھی (فت ا ، سکن پ) صف

قصور وار ، مجرم

تو اس سنگھاسن پر چرن رکھے گا تو اپرادھی ہوگا۔

۱۸۰۵ سنگھاسن بتیسی ، ۶۲

[س : اپرادِھن (اپرادھ + ـِ ن = لاحقۂ صفت)]

اُپْرال (ضم ا ، سکن پ) اُوپرال (قدیم)

رک : '' اوپر ''

مشقت سنیں جاکے اپرال آپ
کہیا کیا ہے دیکھوں پرے یاں میں چھپ

۱۶۰۹ قطب مشتری (ضمیمہ) ، ۲۲

جو صورت گری بھویں کے اپرال ہوئی
رہیں ان کی گویا چنر سال ہوئی

۱۶۶۵ علی نامہ ، ۲۶۶

[قدیم آریا : اُپرِلّ ، پ: اُپِلّ = اوپر کا]

اُپْرالا (ضم ا ، سکن پ) صف (قدیم)

(الف) امذ

معاونت ، مدد ، حفاظت

آج کے دن بیٹا ہوتا تو ہر طرح سے کوشش کر کے اس بات کو تحقیق کرتا اور اپنے باپ کا اپرالا کرتا۔

۱۸۰۲ باغ و بہار ، ۱۲۲

(ب) صف ـ رک : آپرلا

[رک : ” اپرال “]

اُپرانا (ضم ا ، سکن پ) ف ل

۱ ـ الگ تھلگ رہنا ، مانوس نہ ہونا ، اجنبی معلوم ہونا

غیر زبان کا لفظ بھی اردو زبان میں آ کر گھل مل جاتا ہے اور اپراتا نہیں .

۱۹۲۸ باتوں کی باتیں ، ۳۹

۲ ـ غیریت برتنا ، گریز کرنا ، بچنا

۳ ـ اوپر آنا ، باہر نکل آنا

خوشی کا راز اس میں ہے کہ انسان آپے سے نہ اپرائے ـ

۱۹۶۰ رادھا اور رنگ محل ، ۲۹

۴ ـ اٹھانا ، اوپر کرنا

[ار : اوپر + آنا ـ جعلی مصدر]

اُپراو (ضم ا ، سکن پ) امذ (قدیم)

اف : کرنا

غلبہ ، تسلط

س عشق کا پارک ہوا دل کی انگیٹھی پور کر
تو برہ کے اپراو تے شعلے سینے میں دھر دھڑے

۱۶۲۷ عادل شاہ ثانی ، ک ، ۵۰

[ار : آپروانا (= آپرانا) سے حاصل مصدر]

اَپرلا (ضم ا ، فت پ) صف ـ اوَپرلا (عوام)

۱ ـ بالائی ، اوپر کا

۲ ـ بیرونی ، ظاہری

۳ ـ سطحی ، اوپری

[رک : آپرال]

اَپرم پار (فت ا ، پ ، ر ، سکن م) صف (قدیم)

لامحدود ، جس کی حد اور انتہا نہ ہو

میرا جاگا سن نرانکار ہے ، ڈھونڈ کار اپرم پار ـ

۱۵۸۲ کلمۃ الحقائق ، ۲۲

[س : اپرم (= دوسرا) + پار (= حد) = بے حد]

اَپرنٹس (فت ا ، سکن پ ، کس خف ر ، سکن ن ، کس ٹ) امذ

۱ ـ امیدوار ، درخواست گزار ، کسی اسامی کا خواہاں

ایک اپرنٹس جو اخلاق حسین کے پاس ہی رہتا ہے ، مڈل پاس ہے ـ

۱۹۱۴ حالی ، مکتوبات ، ۲ : ۳۲۲

۲ ـ کسی علم ، فن یا عہدے کا کام سیکھنے کے لئے بلااجرت یا بہ اجرت کام انجام دینے والا

۳ ـ نوآموز

[انگ : Apprentice = کسی صنعت و حرفت کا سیکھنے والا]

اُپرنچا (ضم ا ، سکن پ ، فت ر ، سکن ن) امذ

دیوار کا آخری سرا جس پر چھت کی کڑیاں رکھی جاتی یا منڈیر بنائی جاتی ہے

[س : اَپَر (= اوپر) + اَنْچھیدہ (= کٹاو) = اوپر کا کٹاؤ]

اَپْرُوپ (مت ا ، سکن پ ، و مع) صف (قدیم)

۱ ۔ نادر ، انوکھا ، بے مثل

منگایا اتم دات نیزی انوپ
پون سار جلدی میں اپروپ روپ
۱۶۲۵ سیف الملوک ، غواصی ، ۳۳

سو اوتار گج روپ لے آنیا
نمک حسن اپروپ لے دھائیا
۱۶۳۹ طوطی نامہ ، غواصی ، ۶۴

ہر فخر و ھنر میں نکلا اپروپ
اور روپ اتھا اس کا اپروپ
۱۷۷۱ ھشت بشت ، باقر آگاہ ، ۱۳

۲ ۔ اچھا ، خوب ، پسندیدہ

شعر بولنا گرچہ اپروپ ہے
ولے نامنا کہنے تے حوب ہے
۱۶۲۵ قطب مشتری ، ۱۸

سو عالم کوں جینا تو اپروپ ہے
مجے تو اِتا موت محبوب ہے
۱۶۰۹ قصۂ بے نظیر ، صنعتی ، ۳۷

[س : اَپُورُو (ا + پورو = پہلا) بطور قلب]

اُپْروٹا (ضم ا ، سکن پ ، و لین) امذ

۱ ۔ اوپر کی منزل ، بالا خانہ ، کوٹھا ، اٹاری

۲ ۔ چوکھٹ کی اوپر کی لکڑی جو چوکھٹ کی کھڑی لکڑیوں کے اوپر بطور پیشانی ہوتی ہے ، آنرنگا

۳ ۔ چکی کا اوپر کا پاٹ

[س : اُپَر + آوَرْت = اونچا ، تنا ہوا ، ہ : آپراوٹا]

اُپْروٹھا (ضم ا ، سکن پ ، و مع فت) صف

۱ ۔ اوپر کا ، بالائی

۲ ۔ پہلونٹی کا ، اولیں

۳ ۔ اوپری ، اجنبی

[س : اُپَر + ا + سْتھ = اوپر کا]

اَپْریشَن (فت ا ، سکن پ ، ی مع ، فت ش) امذ آپریشن

عمل جراحی ، جسم کے کسی حصے کو علاج کے لئے چاک کرنا ، چیر پھاڑ کے ذریعے مادۂ فاسد یا کسی اور چیز کو جسم سے باہر نکالنا ، یا کسی خرابی کو درست کرنا

کھانسی کی وجہ سے فروری تک آپریشن ملتوی کر دیا ہے ۔
۱۹۱۴ حالی ، مکاتیب ، ۳۸

اس کا آپریشن نہ کرائیں ورنہ پیر کا معاملہ ہے ۔
۱۹۳۸ اقبال ، اقبال نامہ ، ۱ : ۲۷۲

[انگ : Operation = عمل]

اَپْرَیل (فت ا ، سکن پ ، ی لین) امذ ۔ اپرل

انگریزی شمسی سال کا چوتھا مہینہ جو تیس دن کا ہوتا ہے

ان کی کوششوں کا نتیجہ اپریل ۱۸۳۵ء میں ظہور میں آیا ۔

۱۹۳۹ خطبات عبدالحق ، ۵۱

[انگ : April (لاط : Aprilio)]

ـــفُول امذ ۔ **۱ ۔ اپریل کی پہلی تاریخ کو خوش طبعی کے لئے کسی کو دھوکا دے کر بے وقوف بنانے کا دستور جو عیسائیوں میں رائج ہے اور ان کی تقلید میں بعض اور لوگ بھی ایسا ہی کرتے ہیں**

آج تو اپریل کی پہلی تاریخ بھی نہیں ہے کہ ہم سمجھیں سب کو اپریل فول بنایا ۔

۱۸۸۰ فسانۂ آزاد ، ۲ : ۶۸

۲ ۔ (مجازاً) جھوٹ، افواہ جو لوگوں کو بے وقوف بنانے کے لئے اڑائی جائے، باد ہوائی

اپریل فول کہہ کے جو پیچھے سے لی خبر
یہ تینوں لوٹ پوٹ گئے بس برنگ خر

۱۹۳۰ اودھ پنچ، ۱۵ : ۲ ، ۴

[انگ : اپرل + فول (= بے وقوف) Aprilfool = اپریل کا احمق]

اُپَڑ (ضم ا ، فت پ) امث

۱ ۔ اپڑنا کا حاصل مصدر

۲ ۔ کھڑینچم : ذرا سی آپڑ آگئی، اس کو کھال آڑنا نہیں کہتے

[پ : اَپٹ (آد + پٹ) = اکھڑنا]

ـــاٹھنا (محاورہ) رک : اپڑ آنا (۲)

نقش کس کا اپڑ اٹھا منہ پر
اب تو نقشہ نیا بٹھانے ہو

۱۸۰۸ اظفری ، د ، ۴۵

ـــآنا ف ل ۔ **۱ ۔ اکھڑنا**

۲ ۔ کھال پر دانے ابھر آنا ، نشان پڑ جانا، نقش ہوجانا

گردن مبارک پر چادر کے کناروں کے نشان اپڑ آئے تھے۔

۱۹۰۶ الحقوق و الفرائض ، ۳ : ۳۲

اُپڑا دینا (ضم ا ، سکن پ) ف م **مروڑنا، بل ڈالنا** (متروک)

پینچ اپنے چیرہ اجلے کوں جو اپڑا دیا
عاشقاں کو مارنے کھینچا ہے جیوں خنجر سفید

۱۷۰۷ ولی ، ک ، (ضمیمہ اول) ، ۱۶

[ار : اپڑا ('' اپڑ '' کا تعدیہ) + دینا]

اُپڑانا (ضم ا ، سکن پ)

رک : **آپڑنا جس کا یہ تعدیہ ہے**

اپڑنا (ضم ا ، فت پ ، سکن ڑ) ف ل

۱ - جڑ سے اکھڑنا

۲ - (کھال کے ساتھ) مار پڑنا

۳ - چھٹنا ، چھڑایا جانا

۴ - آدھڑنا

۵ - ابھرنا ، نمایاں ہونا

[رک : '' آپاڑ '']

اپڑھ (فت ا ، ب ، سکن ڑھ) صف رک : ان پڑھ

[آر : آ (نافیہ) + پڑھ (س پٹھ = پڑھنا)]

اپس (فت ا ، پ) ضمیر (قدیم ،

۱ - " اپ " (آپ) کی مغیرہ حالت

(i) " اپنا " کی جگہ

یوں اپس میں سب مذھباں کی خبر رکھیا ہے ۔

۱۴۲۲ بندہ نواز ، معراج العاشقین ، ۲۶

سکیا کے کنے جاکے دکھ بولے جو
اپس پر ھنسا لینے منگتا ہے وو

۱۶۰۹ قطب مشتری ، ۵۷

تجھ سے منگتا ہوں دعا اب یاوپ
دے اپس لطف سے مرا مطلب

۱۷۷۱ ھشت بہشت ، باقر آگاہ ، ۲۷

(ii) ' آپ ' (خود) کی جگہ

نیں دکھا کر اپس کے مکھ کی کتاب
علم کھویا ہے دل سوں قاضی کا

۱۷۰۷ ولی ، ک ، ۲۸

مہاجن پاس جا بولے یہ باتاں
انے ماریا اپس کے سر پہ ھاتاں

۱۷۳۷ طالب و موھنی ، ۲۵

۲ - اپ (آپ) کی اضافی حالت ، اپنا کے معنوں میں

سو دیکھ حیراں ہو سارے گگن کے سب رھن ھارے
اپس سد کھو کے بے چارے نجھارے نین عنبر سوں

۱۶۱۱ قلی قطب شاہ ، ک ، ۱۵۵

نہ تھا قام مجکوں مرے گا ککر
کہ پتھر مٹی میں اپس پاؤں پر

۱۶۴۰ چندر بدن و مہیار ، ۱۰۷

لاھوت اپس حساب میں گن

۱۷۰۰ من لگن ، ۱۲۸

[پ : اَپَ تَسِیہ (''اپن'' کی اضافی حالت) = اپنا]

اپسانا (ضم ا ، سکن پ) ف م

خمیر اٹھانا ، سڑانا

[ار آپس (رک) + ا (= تعدیہ) + نا]

اپستا (فت ا ، سکن پ ، فت س) رک : '' اپسٹا ''

جو ھوئی توں مجنوں نمن اپستا
تو میں کچ نصیحت تجے نا کتا

۱۶۳۹ طوطی نامہ ، غواصی ، ۱۸۱

اپسٹا (فت ا ، سکن پ ، فت س) صف ـ '' اپستا ''

بے خود ، جسے اپنی سدھ بدھ نہ ہو ، (مراد) عاشق

نہیں سد منج کوں عالم کی کہ بے سد ہور متا ہوں میں
منی نیں بات منج کس کی کہ دائم اپستا ہوں میں
١٦٣٩ غواصی ، ک ، ١٢٦

[ار : اپ + سٹ (= س : چھٹ = چھوڑنا) + ا (فاعلی)]

اَپسَرا (فت ا ، سکن پ ، فت س) امث

١ - رک : ' اپچھرا "

دونوں پاتر نار ، سندر جیسے راجا اندر کی سبھا کی اپسرائیں۔
١٩٠٣ جام سرشار ، ٧

خلد بریں سے لے کر پھولوں کا آہ زیور
دلہن تجھے بنانے کو آئیں اپسرائیں
١٩١٠ سرور جہاں آبادی ، خمکدۂ سرور ، ٣٢

ارے تم تو سورگ کی اپسرا ہو اپسرا ۔
١٩٣٥ پہلا پیار ، ٣١

٢ - (مجازاً) شریف، مسکین، سگھڑ عورت

ہندوستان ہی ہے جہاں ... اپسرائیں ... نااہلوں کے گلے باندھ دی جاتی ہیں ۔
١٩٣٦ پریم چند ، زاد راہ ، ٢٠٩

٣ - حسینہ ،خوبصورت عوت

راجا صاحب رنواس میں بیٹھے ہوئے چند منتخب اپسراؤں کا گانا سن رہے تھے ۔
١٩٣٦ پریم چند ، پریم پچیسی ، ١ : ١٠٧

اَپسَری (فت ا ، سکن پ ، فت س) امث

رک : " اپسرا "۔

مری ہے اپسری عورت پوچھے تو جواب کیا دیتی
١٦٩٧ ہاشمی ، د ، ١٥٦

اُپَس (ضم ا ، فت پ) امث

١ - خمیر ، سڑاند

٢ - گھمس ، حبس

[رک : " اَبسنا "]

اُپَسنا (ضم ا ، فت پ ، سکن س) رک : " ابسنا "

اُپکار (ضم ا ، سکن پ) امذ

١ - احسان ، کرم

بہوت اس کا اپکار مانیا ۔
١٦٣٢ سب رس ، ٨٥

نکو رکھ کمینیاں کے اپکار میں
نہ مج سرا نوا دام کے بہار میں
١٦٥٧ گلشن عشق ، ٩

کن کھلا کر کے تجھے حسن کا گلزار کیا
کس کی نظر ان کے سبب حسن نے اپکار کیا
١٧٣٣ آبرو (ق) ، ٥٢

٢ - مدد ، خدمت ، حاجت روائی

میں نے تم کو اتنا روپیہ دیا تھا، تم نے اس سے ایک برہمن کا اپکار بھی نہیں کیا ۔
١٩٣٦ پریم چند، گئو دان ، ٨٧

[س : اپکار]

پھول

اخبار پھول کی ۲۵ سالہ جلدوں کا انتخاب، غلام عباس نے
ترقی اردو بورڈ کراچی کے لئے مرتب کیا اور سجاد [illegible]
نے ترقی اردو بورڈ کے تعاون سے شائع کیا۔ قیمت مجلد ۶ روپے